تذکرہ و تبصرہ

ہم اور ہمارا دین — چند لمحاتِ فکریہ!

☆ کیا ہم نے کبھی غور کیا کہ اللہ ربّ العزت نے نبی آخر الزمان رحمۃ للعالمین ﷺ کے ذریعے دین و شریعت جیسی عظیم نعمت ہمیں عطا کی کہ ہم اللہ کے دین کو قائم اور اس کی شریعت کو نافذ کریں —— تاکہ اس عادلانہ نظام کی برکات وثمرات سے پوری نوعِ انسانی بہرہ مند ہو سکے۔ کیا ہمیں اپنی اس اہم دینی ذمہ داری کی ادائیگی کی کچھ فکر بھی ہے؟

☆ ربّ العزت کی دھرتی پر آج طاغوتی اور ابلیسی نظام رائج ہے۔ اللہ اور رسول ﷺ کے عطا کردہ نظامِ عدلِ اجتماعی کو قدموں تلے روندا جا رہا ہے —— کیا اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے وفاداری کا تقاضا نہیں ہے کہ ہم اس طاغوتی نظام کے خلاف علمِ بغاوت بلند کریں اور اسے جڑ سے اکھاڑ کر اللہ کے دین کو قائم و غالب کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیں؟

☆ ہم مسلمانانِ پاکستان‘ اللہ کے فضل و کرم سے صاحبِ ایمان ہیں۔ ہم اللہ پر‘ اس کے رسولؐ پر‘ اس کی کتاب پر اور آخرت پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اللہ نے اپنی کتاب میں مسلمانوں سے وعدہ کیا ہے کہ ﴿وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ یعنی ”اے مسلمانو! تم ہی غالب و سربلند رہو گے اگر تم صاحبِ ایمان و یقین ہوئے!“

تو کیا وجہ ہے کہ ہم دنیا میں ذلیل و خوار ہیں اور ہماری کمزوری اور بے بسی کا یہ عالم ہے کہ آج ہم امریکہ کے غلام اور محکوم بن چکے ہیں؟ کیا اس کا سبب یہی نہیں کہ آج ہم ایمان کی حقیقت سے ناآشنا اور اس کے عملی تقاضوں سے غافل ہیں‘ یعنی اللہ کے دین کو قائم و غالب کرنے کی ذمہ داری سے گریزاں ہیں؟

☆ ہم سب مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ اللہ کا یہ دین جسے نظامِ مصطفیٰ ﷺ بھی کہا جاتا ہے‘ دنیا کا اعلیٰ ترین نظام ہے جو سماجی‘ معاشی اور سیاسی ہر سطح پر کامل عدل و انصاف کا ضامن ہے۔ اس نظام کی برکت سے عام خوشحالی آتی ہے‘ لوگوں کو ان کے تمام حقوق میسر آتے ہیں‘ تعلیم‘ علاج اور انصاف کا حصول یقینی ہو جاتا ہے۔ اس کی درخشاں مثال دورِ خلافتِ راشدہ ہے جو انسانی تاریخ کا سہانا ترین دَور تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اس بہترین دین کو غالب اور نظامِ خلافت کو قائم کرنے کی بجائے بدترین استحصالی اور طاغوتی نظام کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں؟ کیا اس بہترین نظام کی برکات اور عدل و انصاف سے خود کو اور پوری دنیا کو محروم کر کے ہم اللہ کے غضب کو بھڑکانے کا موجب نہیں بن رہے؟ کیا یہ اللہ کی عظیم نعمت کی ناقدری اور کفرانِ نعمت نہیں ہے جس کی سزا آج ہم بھگت رہے ہیں؟

☆ سورۃ المائدۃ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور جو لوگ اللہ کی نازل کردہ ہدایت یعنی دین و شریعت کے مطابق فیصلے نہ کریں وہی تو ہیں جو کافر ہیں ......اور جو لوگ اللہ کی نازل کردہ ہدایت یعنی دین و شریعت کے مطابق فیصلے نہ کریں وہی تو ہیں جو ظالم ہیں ......اور جو لوگ اللہ کی نازل کردہ ہدایت یعنی دین و شریعت کے مطابق فیصلے نہ کریں وہی تو ہیں جو فاسق ہیں۔''

غور طلب بات یہ ہے کہ کیا ہمارے ملک میں تمام ریاستی امور اللہ کے دین کے مطابق طے پاتے ہیں اور کیا ہماری عدالتوں میں سب فیصلے آج اللہ کی نازل کردہ شریعت کے مطابق ہو رہے ہیں؟ اگر نہیں' اور یقیناً نہیں' تو پھر کیا ہم مسلمانانِ پاکستان اللہ کی نگاہ میں ایک اعتبار سے کافر' ظالم اور فاسق نہیں ٹھہرتے؟ ایسی حالت میں اللہ کی رحمت کے مستحق کیونکر بن سکتے ہیں؟

سیدھی سی بات یہ ہے کہ دنیا میں ہماری ذلت و رسوائی اور زوال و پستی کا اصل سبب یہ ہے کہ ہم نے اللہ کے دین کو نظر انداز کر کے باطل نظام کی بالادستی کو ذہنی و عملی طور پر قبول کر لیا ہے۔ ذاتی زندگی میں بھی ہم اللہ کے دین اور اس کے رسولﷺ کی سنت سے کوسوں دور ہیں' ہم مغربی تہذیب اور ہندوانہ ثقافت کو خوش آمدید کہنے میں پیش پیش ہیں' لیکن اسوۂ رسولﷺ کو اپنانے' احکامِ شریعت پر عمل کرنے اور اللہ کے دین کو قائم و نافذ کرنے کے لیے تو ہرگز آمادہ اور تیار نہیں۔ ہمارے انہی قومی جرائم کی سزا آج ہم پر مسلط ہے' جس کے مظاہر قتل و غارت گری' بدامنی' ہوشربا مہنگائی' ظلم و جبر' بے انصافی' سیاسی حقوق سے محرومی' بدترین ریاستی جبر' افلاس' بے روزگاری' افراطِ زر' کرپشن' شعائرِ اسلامی کی بے حرمتی' دینی و اخلاقی اقدار کی پامالی' ملکی آزادی و خودمختاری سے محرومی' شمالی وزیرستان' وانا اور بلوچستان میں خانہ جنگی کی سی کیفیت' کشمیر پالیسی اور خارجہ پالیسی کی ناکامی اور ملکی امور میں امریکہ کی بڑھتی ہوئی مداخلت کی صورت میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

ان تمام مسائل کا حل ''علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی!'' کے مصداق ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ ہم بحیثیتِ امتی اپنی ذمہ داری ادا کرنے کے لیے خود بھی پورے کے پورے دین میں داخل ہو جائیں اور اللہ اور اس کے رسولﷺ کے عطا کردہ اس ''دینِ حق'' کو پاکستان میں قائم و غالب کرنے کے لیے اجتماعی طور پر سرگرم عمل ہو جائیں۔ یعنی اللہ کی حاکمیت کو قائم کرنے اور تمام ریاستی و حکومتی معاملات کو قرآن و سنت کے تابع کرنے' بالفاظِ دیگر خلافت راشدہ کا نظام قائم کرنے کے لیے سردھڑ کی بازی لگا دیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو اللہ کی رحمت و نصرت ہمارے شاملِ حال ہو جائے گی اور یہ ملکِ خداداد پاکستان جو گزشتہ نصف صدی سے مسلسل بحرانی کیفیت سے دوچار ہے اور اب امریکہ جیسی طاغوتی قوت کی غلامی کے شکنجے میں ہے' دینِ حق کی برکت سے حقیقی آزادی و خوشحالی کی دولت سے مالا مال اور امن و سلامتی کا گہوارہ بن جائے گا۔ اور ''اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ'' کا وعدۂ الٰہی ہمارے حق میں پورا ہو کر رہے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ ○○

تذکرہ و تبصرہ

آخری صلیبی جنگ

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ

کا ۲/ستمبر ۲۰۰۵ء کا خطابِ جمعہ

بمقام قرآن اکیڈمی ماڈل ٹاؤن لاہور

ترتیب و تلخیص : **کلیم اللہ**

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولہِ الکریم ...... امَّا بَعد:

اعوذ باللّٰہ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوا الۡیَهُوۡدَ وَالنَّصٰرٰۤی اَوۡلِیَآءَ ؕ بَعۡضُهُمۡ اَوۡلِیَآءُ بَعۡضٍ ؕ وَمَنۡ یَّتَوَلَّهُمۡ مِّنۡکُمۡ فَاِنَّهٗ مِنۡهُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۵۱﴾﴾ (المائدۃ)

جیسا کہ آپ کے علم میں ہے' آج مجھے آخری صلیبی جنگ کے موضوع پر گفتگو کرنی ہے۔ یہ موضوع انتہائی اہم بھی ہے اور اس میں ہمارے لیے غور وفکر کا بہت سا سامان بھی موجود ہے۔

گفتگو کے آغاز میں چند بنیادی باتوں کا تذکرہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ یہ اصطلاح یعنی ''آخری صلیبی جنگ'' جو میں نے استعمال کی ہے' میری نہیں ہے' بلکہ عیسائیوں کے ایک فرقے Baptists کی ہے' جو کہ پروٹسٹنٹ عیسائی ہیں اور ان میں سے بھی جو اَخص ّالخواص ''Evangelists'' ہیں' ان کے میگزین Trumpet میں ''The Last Crusade'' کے عنوان سے ایک مقالہ شائع ہوا

ہے۔اس مقالے کا ایک ٹکڑا کچھ یوں ہے:

"Most people think the crusades are a thing of the past- over forever. But they are wrong. Preparations are being made for a final crusade, and it will be the bloodiest of all!"

''بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ صلیبی جنگیں ماضی کی بات ہے اور ختم ہو چکی ہیں' لیکن ان کی یہ رائے درست نہیں ہے۔آخری صلیبی جنگ کے لیے تیاریاں جاری ہیں اور یہ انتہائی خونی جنگ ہو گی''۔

اس مضمون کو واضح طور پر سمجھنے کے لیے ہمیں تاریخ انسانی کو تین ادوار میں تقسیم کرنا ہو گا:

۱) پہلا ملینیم ۔۳۰ ء سے ۱۰۰۰ ء تک

۲) دوسرا ملینیم ۔۱۰۰۱ ء سے ۱۹۹۹ ء تک

۳) تیسرا ملینیم ۔۲۰۰۰ ء سے جو اَب تک جاری ہے۔

یہاں پر یہ واضح رہے کہ ملینیم کی اصطلاح جو عیسائی اور یہودی استعمال کرتے ہیں' وہ آسمانی کتابوں کے عین مطابق ہے۔قرآن مجید میں دو بار ارشاد ہوا کہ ''اللہ تعالیٰ کا ایک دن ہزار برس پر محیط ہے۔'' سورۃ الحج میں الفاظ آئے ہیں:

﴿وَاِنَّ یَوۡمًا عِنۡدَ رَبِّکَ کَاَلۡفِ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ﴾

''اور ایک دن تمہارے ربّ کے یہاں ہزار برس کے برابر ہوتا ہے جو تم گنتے ہو''۔

اسی طرح سورۃ السجدۃ میں ارشاد ہوا:

﴿یُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الۡاَرۡضِ ثُمَّ یَعۡرُجُ اِلَـیۡہِ فِیۡ یَوۡمٍ کَانَ مِقۡدَارُہٗۤ اَلۡفَ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ﴾

''وہ تدبر سے اُتارتا ہے کام آسمان سے زمین تک' پھر چڑھتا ہے وہ کام اُس کی طرف ایک دن میں جس کا پیمانہ ہزار برس کا ہے تمہاری گنتی میں''۔

پہلے ملینیم کے آغاز پر صورت حال یہ تھی کہ یروشلم جو کہ یہودیوں کا شہر تھا اور یہاں وہ ایک عرصے سے آباد تھے' یہیں پر ان کا ہیکلِ سلیمانی (Solomon's Temple)

بھی تھا‘ جو حضرت سلیمان علیہ السلام نے بنایا تھا اور ۵۸۷ ق م میں اسے عراقی بادشاہ بخت نصر (Nebukadnezar) نے منہدم کر دیا تھا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ اسے انہوں نے دوبارہ تعمیر کیا تھا‘ لیکن ۷۰ء میں طیطس (Titus) نامی ایک رومی جرنیل نے حملہ کیا جس میں یہودیوں کو بڑی خوفناک شکست ہوئی۔ اس قدر خون ریزی ہوئی کہ ٹائٹس رومی نے صرف ایک دن میں کم و بیش ایک لاکھ تینتیس ہزار یہودیوں کو قتل کیا اور جو Second Temple انہوں نے تعمیر کیا تھا وہ بھی مسمار کر دیا۔ یہاں یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ یہودیوں کے نزدیک ہیکل سلیمانی کی وہی اہمیت ہے جو ہمارے نزدیک کعبہ کی ہے اور ۱۹۳۵ برس ہونے کو آئے ہیں لیکن ان کا یہ کعبہ آج تک گرا پڑا ہے۔ بہرحال ٹائٹس رومی کے ہاتھوں قتل عام کے بعد جو یہودی بچ گئے انہیں فلسطین کے علاقے سے نکال دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جس کے جہاں سینگ سمائے چلا گیا اور یروشلم یہودیوں سے کُلی طور پر خالی ہو گیا۔ فلسطین سے انخلاء کے اس دَور کو یہودی بجا طور پر اپنا ”دورِ انتشار“ (Diaspora) کہتے ہیں۔

اس واقعہ کے تقریباً ۶۰۰ برس بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اسلامی فتوحات کا جو سلسلہ شروع ہوا‘ اُسی میں مسلمانوں نے یروشلم پر بھی حملہ کیا‘ جو اُس وقت عیسائیوں کے قبضہ میں تھا۔ صورت حال یہ تھی کہ اس شہر کی فصیلیں بے انتہا اونچی تھیں اور اندر راشن بھی وافر مقدار میں موجود تھا۔ چنانچہ عیسائیوں نے فصیلوں کے دروازے مقفّل کر دیے اور خود اندر محصور ہو گئے۔ نتیجتاً ایک طویل محاصرے کے بعد بھی مسلمانوں کو کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اسی دوران عیسائیوں کے چند بڑے عالم فصیل پر آئے اور مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ ”تم ہزار برس تک بھی یہاں پڑے رہو گے تب بھی تمہارے ہاتھ پر یہ شہر فتح نہیں ہو گا۔ ہاں ہماری کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ اسے ایک درویش بادشاہ کے ہاتھوں فتح ہونا ہے‘ لیکن تمہارے درمیان وہ درویش بادشاہ نظر نہیں آ رہا“۔ اس بات کا پس منظر سمجھ لیجیے۔ اسلام کا اوّلین دَور مسلمانوں کے لیے غربت اور افلاس کا دَور تھا۔ بعد ازاں فتوحات کے نتیجے میں جو مالِ غنیمت مسلمانوں

کے ہاتھ لگا اُس سے حالات بہتر ہونا شروع ہو گئے تھے اور اب انہوں نے شامیوں کے سے انداز میں اچھا لباس استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ چونکہ مسلمان کافی عرصہ سے شام میں تھے لہٰذا شامی تہذیب کا اثر اُن کے رہن سہن میں نمایاں نظر آ رہا تھا۔

عیسائی عالموں کی بات سے امیرِ لشکر حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ (جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان میں اَمِیْنُ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ کا لقب ملا تھا) کو خیال ہوا کہ ان کا اشارہ یقیناً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف ہے۔لہٰذا محاذِ جنگ سے حضرت عمرؓ کی خدمت میں ایک درخواست روانہ کی گئی کہ اگر آپ خود تشریف لائیں گے تو یروشلم بغیر لڑائی کے فتح ہو جائے گا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ خود یروشلم روانہ ہوئے۔ یہ حضرت عمرؓ کا وہی تاریخی سفر ہے جو اسلامی تاریخ کا ایک انتہائی روشن باب ہے۔اس سفر میں صرف ایک سواری (اونٹ) تھی۔ راستے کے لیے راشن بھی اسی پر لدا ہوا تھا۔ لہٰذا ایک وقت میں ایک آدمی ہی اُس پر بیٹھ سکتا تھا۔ اندریں حالات ایک منزل میں خلیفہ سواری کے اوپر تشریف فرما ہوتے اور آپؓ کا خادم نکیل ہاتھ میں پکڑے آگے آگے چلتا، اگلی منزل پر خادم سواری کے اوپر بیٹھتا اور خلیفۂ وقت نکیل تھامے آگے چل رہے ہوتے۔ مساوات کا یہ عملی نمونہ تاریخ انسانی نے کم کم ہی دیکھا ہوگا۔ جب آخری منزل شروع ہوئی تو اتفاق سے سواری پر بیٹھنے کی باری خادم کی تھی۔ اُس نے بہت اصرار کیا کہ آپؓ اونٹ پر بیٹھ جائیے، لوگ کیا کہیں گے؟ لیکن حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ نہیں! باری تمہاری ہے، لہٰذا تمہیں ہی اونٹ پر بیٹھنا ہوگا۔ لہٰذا جب یروشلم میں داخل ہوئے تو لوگوں نے دیکھا کہ وہ خلیفۂ وقت جس کے نام سے قیصر و کسریٰ کے ایوان کانپتے تھے، اس شان سے چلے آ رہے ہیں کہ ایک ہاتھ میں اُونٹ کی نکیل ہے اور دوسرے ہاتھ میں اپنے جوتے پکڑے ہوئے ہیں، جبکہ خادم سواری کے اوپر بیٹھا ہے۔ حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے آپؓ کا استقبال کیا اور اسی طرح سیدھے آپؓ کو فصیل کے قریب لے گئے اور عیسائیوں کو پکار کر کہا کہ یہ ہیں ہمارے خلیفہ! عیسائیوں نے اپنی کتابوں کے مطابق جو نشانیاں ملائیں تو اس بات پر صاد کیا کہ یہی وہ بادشاہ ہیں جن کے ہاتھ پر یہ شہر فتح ہونا

ہے۔ لہٰذا فصیل کے دروازے کھول دیے گئے۔ مسلمان افواج اندر داخل ہوگئیں اور یروشلم بغیر کسی لڑائی کے مسلمانوں نے فتح کرلیا۔

اس موقع پر مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔ اس معاہدے کے وقت عیسائیوں کا یہ مطالبہ مان لیا گیا کہ مسلمان یہودیوں کو یروشلم میں آباد ہونے کی اجازت نہیں دیں گے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ طے فرمادیا کہ یروشلم یہودیوں کے لیے کھلا شہر (open city) تو ہوگا' تاکہ وہ یہاں آ کر اپنے مقدس مقامات کی زیارت کریں' لیکن نہ تو وہ یہاں آباد ہوسکیں گے اور نہ ہی کوئی جائیداد وغیرہ خرید سکیں گے۔ یہ تو تھے وہ اہم واقعات اور حالات جو پہلے ملینیم کے دوران پیش آئے۔

اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم پہلے ملینیم کے اختتام پر اُس واقعہ کی طرف بڑھتے ہیں جو کہ انتہائی اہم ہے' اور وہ واقعہ تھا پورے عالم عیسائیت کا اتحاد۔ یہاں پر یہ بات سمجھنے کی ہے کہ اس واقعہ سے پیشتر عیسائی دنیا کئی سو برس سے دو حصوں میں منقسم تھی۔ مذہبی اعتبار سے اٹلی' فرانس' جرمنی' سپین اور انگلستان کے علاقوں پر مشتمل عیسائیت مغربی عیسائیت کہلاتی تھی' جس کا سربراہ پوپ تھا اور اس کا صدر مقام روم (رومۃ الکبریٰ) تھا۔ اس کے برعکس دوسرا حصہ جو جنوب مشرقی یورپ اور مشرقی یورپ کے عیسائی ممالک پر مشتمل تھا' یہاں کی عیسائیت مشرقی عیسائیت کہلاتی تھی۔ اس کا صدر مقام قسطنطنیہ (Constantinople) تھا۔ بہرحال دونوں حصوں کے اتحاد کے بعد پوپ کو عیسائی دنیا کے مرکزی رہنما کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

دوسرے ملینیم کے شروع ہونے کے ٹھیک ۹۵ برس بعد یعنی ۲۰ نومبر ۱۰۹۵ء کو اُس وقت کے پوپ اربن ثانی (Urban-II) نے فرانس کے ایک شہر Clermont میں ایک انتہائی اہم خطاب کیا' جس میں اُس نے یہ بات زور دے کر کہی کہ ''ہمارا یہ اہم ترین مذہبی فریضہ ہے کہ مسلمانوں کے خلاف جہاد کریں اور ان سے اپنے مقدس مقامات چھین لیں۔'' کیونکہ پہلے ملینیم کے اختتام پر فلسطین اور شام کے علاقے بشمول یروشلم مسلمانوں کے قبضہ میں تھے۔ اس علاقے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ:

Too small a geography but too big a history.

اس کی وجہ سمجھ لیجیے کہ اس علاقے میں تینوں ابراہیمی مذاہب یعنی یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے مقدس مقامات ہیں۔ اسی اہمیت کی وجہ سے یہاں تصادم بھی بڑا شدید ہوا۔

بہرحال پوپ اربن ثانی کی مذکورہ بالا تقریر سے عیسائی دنیا میں ایک آگ لگ گئی۔ چنانچہ پورے یورپ پر مشتمل ایک بہت بڑی فوج تیار کی گئی، جس میں قائدانہ کردار فرانس اور جرمنی کا تھا۔ عیسائیوں نے مسلمانوں پر حملے شروع کر دیے اور اس طرح باقاعدہ طور پر جنگ کا آغاز ہوگیا۔ اس جنگ (war) کا سلسلہ ۱۰۹۷ء سے شروع ہوکر ۱۲۹۱ء تک تقریباً ۱۹۴ برس جاری رہا۔ واضح رہے کہ جنگ (war) اور لڑائی (battle) میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ایک جنگ کئی لڑائیوں پر مشتمل ہوسکتی ہے۔ یعنی جنگ تو مسلسل جاری رہتی ہے، اس کے اندر بے شمار لڑائیاں اور معرکے ہوتے رہتے ہیں، کبھی ایک مقام پر اور کبھی دوسرے مقام پر۔ عام طور پر ہم جنگ کا لفظ بھی لڑائی کے معنی میں استعمال کر لیتے ہیں۔ بہرحال اس طویل جنگ کے دوران سینکڑوں لڑائیاں (battles) ہوئیں، لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ بڑی بڑی جنگیں بھی ۹ یا ۱۳ کی تعداد میں ہوئیں۔ ان جنگوں کو عیسائیوں نے صلیبی جنگوں (The Crusades) کا نام دیا تھا۔

صلیبی جنگوں کو ہم تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا دَور ۱۰۹۷ء سے لے کر ۱۱۴۴ء تک کے عرصے پر محیط ہے۔ اس دَور میں عیسائیوں کا جوش و خروش دیدنی تھا، کیونکہ انہیں بتایا گیا تھا کہ اگر اس مقدس جنگ میں تمہاری جان بھی چلی گئی تو تم سیدھے جنت میں جاؤ گے اور تمہارے تمام گناہ بھی معاف کر دیے جائیں گے۔ یہاں پر یہ بات غور طلب ہے کہ جہاد کے ضمن میں آج مسلمانوں کو جس طرح بدنام کیا جا رہا ہے اس سے کہیں زیادہ قابل مذمت جہاد کا وہ نعرہ تھا جو پوپ اربن ثانی نے ۱۰۹۵ء میں لگایا تھا۔ بہرحال لاکھوں کی تعداد میں عیسائی افواج ایشیا کی طرف روانہ ہوئیں۔ راستے میں جو بستیاں بھی آئیں وہ لوٹ لی گئیں۔ یہاں یہ بات بھی نوٹ رکھیے کہ عیسائیوں کا اصل ہدف تو وہ مسلمان تھے جن کے علاقوں میں ان کے مقدس مقامات

تھے اوران علاقوں کو مسلمانوں سے بازیاب اورواگزار کرانا ان کا ہدف تھا' لیکن ساتھ ہی عیسائیوں کو یہودیوں پر بھی بے پناہ غصہ تھا' جو حضرت مسیح علیہ السلام کو نعوذ باللہ ولدُ الزنا' جادوگر اور شعبدہ باز کہتے تھے۔ چنانچہ اندازہ کیجیے کہ ان کے بارے میں عیسائیوں کے غیظ و غضب کا کیا عالم ہو گا جو حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا' الوہیت میں شریک بلکہ خدا تک مانتے ہیں! بہرحال ان لڑائیوں میں جہاں مسلمانوں کو شدید نقصان اٹھانا پڑا وہاں اَن گنت یہودی بھی مارے گئے۔ جو یہودی بستی بھی راستے میں آئی لوٹ لی گئی اور وہاں خوب قتل و غارت کا بازار گرم ہوا۔ گویا اس صلیبی جنگ میں مسلمان اور یہودی زیرِعتاب (persecuted) ہونے کے اعتبار سے یکجا (bracketted) تھے۔

یہاں یہ امر واضح رہے کہ جب یہ واقعات پیش آ رہے تھے عالم اسلام پر اُس وقت بنوعباس کی حکومت تھی' جو اگرچہ قانونی طور پر مرکزی حکومت کہلاتی تھی' لیکن بنوعباس اُس وقت کافی کمزور ہو چکے تھے۔ ان کی سلطنت کے اندر کئی چھوٹے چھوٹے حکمران پیدا ہو چکے تھے۔ کہیں سلجوقی' کہیں بربر' کہیں ممالیک اور کہیں کوئی اور تھے' اور سب کی اپنی خود مختار حکومتیں تھیں۔ عباسی خلیفہ تو بس ایک علامت (symbol) تھا جس کی آشیرواد حاصل کر کے وہ اپنی حکومت کے لیے سندِ جواز لیتے تھے۔ اِن حالات میں مسلمان کمزوری کی بنا پر اپنا دفاع کرنے کی پوزیشن میں ہی نہیں تھے' نتیجتاً ان کے خلاف عیسائیوں کو بے شمار فتوحات حاصل ہوئیں۔ بحیرۂ روم (Mediterranean) کے ساحلی علاقوں میں' جن میں شام' فلسطین اور مصر کے علاقے بھی شامل تھے' عیسائیوں نے زبردست لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم کیا اور ان علاقوں کو فتح کر کے چار آزاد عیسائی ریاستیں قائم کیں۔

ان جنگوں کا دوسرا دَور ۱۱۴۴ء سے ۱۱۹۶ء تک کے عرصے پر محیط ہے۔ اس دَور میں مسلمانوں کے اندر کچھ ہمت پیدا ہوئی۔ اسی دوران میں مسلمانوں میں ایک بہت بڑے مجاہد اور غازی سلطان صلاح الدین ایوبی عیسائیوں کے مقابلے میں آئے اور ۱۱۸۷ء میں انہوں نے صلیبیوں کو شکست دے کر انہیں یروشلم سے نکالا اور وہاں اسلامی

حکومت قائم کردی۔ واضح رہے کہ یروشلم صلیبی جنگ کے پہلے دَور (۱۰۹۹ء) میں عیسائیوں کے قبضہ میں چلا گیا تھا اور سلطان صلاح الدین ایوبی نے ۸۸ برس بعد اسے واگزار کروایا۔ اسی دوران میں مسلمانوں نے اپنے کچھ مزید علاقے بھی بازیاب کروالیے۔

ان جنگوں کا تیسرا دَور ۱۱۹۶ء سے ۱۲۹۱ء کے عرصہ پر محیط ہے۔ اس عرصے میں عیسائیوں کی طرف سے یروشلم دوبارہ فتح کرنے کے لیے پے در پے کوششیں ہوئیں۔ کبھی جرمنی، کبھی فرانس اور کبھی دیگر یورپی طاقتوں کی طرف سے فوج کشی کی گئی۔ ایک موقع پر رچرڈ شیر دل(Richard, the Lion hearted) جو اُس وقت انگلستان کا بادشاہ تھا، خود فوج لے کر آیا، لیکن اسے بھی سلطان صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں شکست فاش ہوئی اور وہ مجبوراً صلح کر کے واپس چلا گیا۔

اسی دوران میں ایک مرحلے پر سلجوقی بادشاہ الملک کامل کے دَور میں صلیبیوں نے پھر حملہ کیا اور وہ مقابلہ نہ کر سکا، لہٰذا اُس نے معاہدہ کر کے یروشلم دوبارہ عیسائیوں کے حوالے کر دیا۔ اس مرتبہ یروشلم ۱۶ برس تک عیسائیوں کے زیر قبضہ رہا۔ گویا ۱۹۴ برس کی ان صلیبی لڑائیوں میں ۱۰۴ برس تک یروشلم عیسائیوں کے قبضہ میں رہا۔ بالآخر مسلمانوں نے اپنے سارے علاقے دوبارہ بازیاب کرا لیے اور ۱۲۹۱ء میں صلیبی جنگ کا یہ دَور اختتام پذیر ہوا۔ یہ تھا پہلی صلیبی جنگ کے دوران مختلف لڑائیوں اور معرکوں کا ایک مختصر جائزہ۔

جہاں تک دوسری صلیبی جنگ کا معاملہ ہے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ شروع ہونے والی ہے، لیکن میرے نزدیک یہ پچھلی صدی کے اوائل میں شروع ہو چکی ہے۔ گویا اس جنگ کا آغاز ہوئے قریباً سو برس ہو چکے ہیں۔ جیسا کہ آپ کے علم میں ہے، پہلی جنگ عظیم جو ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی اس میں ترکی کو شکست ہوئی اور اس کے نتیجے میں عظیم سلطنت عثمانیہ کے ٹکڑے کر دیے گئے اور بالآخر خلافتِ عثمانی ۱۹۲۴ء میں کلیتہً ختم ہو گئی۔ اس جنگ کے دوران جب شام فتح ہوا اور اتحادی فوجیں دمشق میں داخل ہوئیں تو جنرل ایلن بی نے، جو مسلح افواج کی کمان کر رہا تھا، سلطان صلاح الدین ایوبیؒ

کی قبر کو ٹھوکر مار کر کہا تھا: "Saladin, We are again here!" یعنی ۱۱۸۷ء میں تم نے ہمیں شکست دی تھی اور یہاں سے نکال دیا تھا' لیکن اب ہم دوبارہ آ گئے ہیں اور اب دوبارہ یہاں ہمارا قبضہ ہے۔ یہ پہلا دَور تھا اس آخری صلیبی جنگ کا جس کو شروع ہوئے قریباً ۹۰ برس ہو چکے ہیں۔

یہاں یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ جنگ عظیم اوّل کے دوران ایک بہت بڑی تبدیلی آ چکی تھی' اور وہ یہ تھی کہ عیسائیوں اور یہودیوں کے درمیان ایک عرصہ سے جاری دشمنی ختم ہو چکی تھی اور اب ان کے درمیان گہرا گٹھ جوڑ ہو چکا تھا' بلکہ صحیح تر معنوں میں عیسائی یہودیوں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے اُن کے آلۂ کار بن چکے تھے۔ اس دوستی کا نتیجہ ۱۹۱۷ء کے اعلانِ بالفور (Balfour) کی صورت میں سامنے آیا' جس کے مطابق یہودیوں کو یروشلم میں آباد ہونے کا حق حاصل ہو گیا۔ گویا یہ ایک تحفہ تھا جو عیسائیوں نے یہودیوں کو دیا۔

جیسا کہ پہلے تذکرہ ہو چکا ہے' حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں جب یروشلم مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہوا تھا تو مسلمان اور عیسائیوں کے درمیان ایک معاہدے کی رو سے یہودیوں کو اس بات کی اجازت نہ تھی کہ وہ یروشلم میں آباد ہو سکیں یا وہاں کوئی جائیداد وغیرہ خرید سکیں۔ اس معاہدے کی بعد میں آنے والے تمام مسلمان حکمرانوں نے' خواہ وہ بنواُمیہ تھے یا بنوعباس تھے یا عثمانی تھے' پوری طرح پابندی کی۔ حالانکہ اس دوران میں یہودیوں نے ہر طرح سے کوششیں کیں کہ وہ کسی طریقے سے یروشلم میں آباد ہونے کی اجازت حاصل کر لیں۔ سلطان عبدالحمید خان (عثمانی خلیفہ) کو تو بہت بڑی رشوت پیش کی گئی کہ آپ کے ذمے تمام قرضے معاف کر دیے جائیں گے' اور آپ کا خزانہ جو آپ کے پیش روؤں کی فضول خرچیوں کی وجہ سے خالی ہو چکا ہے اسے بھی بھر دیا جائے گا' لیکن عثمانی خلیفہ کا موقف تھا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے کیے ہوئے معاہدے میں وہ کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے۔ بہرحال اعلانِ بالفور کے مطابق یہودیوں کے فلسطین میں آباد ہونے کا راستہ کھل گیا۔ اس کے نتیجہ میں ۱۹۴۸ء میں

اسرائیل کی ریاست قائم ہوگئی اور یوں یہودیوں اورعیسائیوں کے گٹھ جوڑ پر مہر تصدیق ثبت کردی گئی۔

عرب ممالک نے اسرائیل کے قیام پر شدید احتجاج کیا جس کے باعث اسی سال عربوں اوراسرائیل کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔اس جنگ میں عربوں کو شکست ہوئی اور انہیں بے حد نقصان اٹھانا پڑا۔تقریباً ۱۹ برس بعد یعنی ۱۹۶۷ء میں مصر‘ شام اور اردن سے اسرائیل کی دوبارہ جنگ ہوئی۔ باوجود اس کے کہ مذکورہ بالا تینوں ممالک اکٹھے ہو کر اسرائیل کے خلاف میدان میں آئے‘ اس مرتبہ پھر انہیں اسرائیل کے ہاتھوں تباہ کن شکست سے دوچار ہونا پڑا۔نتیجتاً اسرائیل نے مصر سے جزیرہ نمائے سینا‘ شام سے جولان کی پہاڑیاں اور اردن سے پورا مغربی کنارہ (West Bank) چھین لیا۔ اس ساری صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ عرب دن بدن کمزور سے کمزور تر اور اسرائیل مضبوط سے مضبوط تر اور طاقتور ہوتا چلا گیا۔

اس تناظر میں اِس وقت کی صورت حال کے مطابق معاملات مختلف سمتوں میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ایک طرف تو پورے یورپ کو یورپی یونین کی شکل میں دوبارہ متحد کیا جا رہا ہے (جیسا پہلی صلیبی جنگ کے دوران ہوا تھا) مزید برآں نیٹو (NATO) کو بھی ازسرِ نو منظّم اور وسیع کیا جا رہا ہے۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ اب اس ساری activity کا مقصد کیا ہے؟ USSR تو ختم ہو چکا۔اس مہم جوئی کا مقصد یہ بیان کیا جا رہا ہے کہ ''اب ہمیں مسلم فنڈا منٹلزم سے نمٹنا ہے۔''

اس ساری صورت حال میں رومن کیتھولکس تو چاہتے ہیں کہ پورا یورپ متحد ہو کر ایک ملک بنے جس میں ایک خالص عیسائی حکومت قائم ہو اور اس طرح آخری صلیبی جنگ کی طرف پیش قدمی ہو۔اس ضمن میں عیسائیوں کے پیشِ نظر کیا کیا عزائم ہیں‘ اس کی ایک چھوٹی سی جھلک آپ کو انڈونیشیا کے جزیرہ مشرقی تیمور کے واقعات میں نظر آ جائے گی۔مشرقی تیمور انڈونیشیا کا بہت بڑا جزیرہ تھا‘ جہاں عیسائیوں کی اکثریت تھی۔ لہٰذا معمولی سے فساد کا بہانہ بنا کر وہاں رومن کیتھولک حکومت قائم کر دی گئی۔اسی بنا پر

پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے ترجمان رسالے Trumpet (جس کا ذکر مضمون کے آغاز میں آچکا ہے) کا یہ کہنا ہے کہ پوپ جان پال سیکنڈ نے یورپ کے اتحاد کی جس طرح کوششیں کی ہیں وہ مقدس سلطنت روما (Holy Roman Empire) کو از سر نو زندہ کرنے کے لیے ہیں تاکہ عیسائی صلیبی جہاد کریں اور حملہ کر کے مشرقِ وسطیٰ میں واقع عیسائیوں کے تمام مقدس مقامات مسلمانوں سے چھین لیں۔

البتہ جہاں تک پروٹسٹنٹس کا تعلق ہے وہ یہود کے ساتھ ہیں اور ان کے پیشِ نظر عظیم تر اسرائیل (Greater Israel) کا قیام ہے، جو فلسطین، عراق، شام، اردن، لبنان کے تمام علاقوں، جزیرہ نمائے سینا، مصر کے جشن کے علاقہ اور دریائے نیل کے ڈیلٹا (زرخیز شمالی علاقہ)، ترکی کے جنوبی حصے اور حجازِ مقدس کے شمالی حصے بشمول مدینہ منورہ پر مشتمل ہو۔ آپ کو معلوم ہے کہ جزیرہ نمائے سینا یہود کے لیے بہت مبارک اور متبرک علاقہ ہے۔ اسی میں کوہ طور بھی ہے جہاں پر حضرت موسیٰ علیہ السلام متعدد بار اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے اور یہیں انہیں تورات عطا کی گئی۔ مصر کا اکثر و بیشتر علاقہ بالکل بنجر اور صحرا ہے۔ صرف دریائے نیل کے دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ قریباً دس میل اِدھر اور دس میل اُدھر روئیدگی اور ہریاول ہے۔ البتہ شمال میں بحیرۂ روم میں گرنے سے پہلے دریائے نیل کی بہت سی شاخیں ہو جاتی ہیں اور یہ ڈیلٹا کا علاقہ بہت زرخیز ہے۔ یہاں پر حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو آباد کیا تھا۔ یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے (بنی اسرائیل) اپنے خاندانوں کے ساتھ یہاں آباد ہو گئے اور کئی سو سال میں ان کی تعداد کئی لاکھ ہو گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جب بنی اسرائیل کا مصر سے خروج (Exodus) ہوا اور آلِ فرعون کو غرق کیا گیا تو اُس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نکلنے والے یہودیوں کی تعداد چھ لاکھ تھی۔ مصر کے جس علاقے میں بنی اسرائیل حضرت یوسف علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے تک مقیم رہے اسے بھی وہ گریٹر اسرائیل میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔

فلسطین میں اہم ترین جگہ Temple Mount ہے۔ یہ ایک پہاڑی سی

ہے جس کے اوپر ایک مستطیل بنتی ہے جو کہ چاروں طرف سے اٹھی اور اُبھری ہوئی ہموار جگہ ہے اور اس کے اوپر ایک میدان کی شکل بن جاتی ہے۔ اس مستطیل کے اندر مسلمانوں کے دو انتہائی متبرک مقامات ہیں' یعنی جنوبی گوشے میں مسجد اقصیٰ اور شمالی گوشے میں قبۃ الصخریٰ (Dome of the Rock) ہے جہاں سے رسول اللہ ﷺ کا آسمانی سفر (معراج) شروع ہوا تھا۔ دراصل یہ ایک پہاڑی تھی جس پر اُموی خلیفہ عبدالملک بن مروان نے ایک گنبد تعمیر کروا دیا تھا۔ مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخریٰ ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ سے پہلے اردن کے پاس تھے۔ اُس وقت اردن کے بادشاہ نے اس گنبد پر ۳۰ ٹن سونے کی پتری چڑھائی تھی۔ اس سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ کتنا بڑا گنبد ہے۔ اسی وقت یہودی اخبارات نے لکھ دیا تھا کہ جب ہم اس کو گرا کر اپنا تیسرا معبد (Third Temple) تعمیر کریں گے تو یہ سونا اس کی تعمیر میں ہمارے کام آئے گا۔ معبد کی تعمیر کے بعد وہ اس میں حضرت داوٗد علیہ السلام کا تخت (Throne of David) لا کر رکھنا چاہتے ہیں جو اِس وقت لندن میں پارلیمنٹ سے ملحق گرجا (ویسٹ منسٹر ایبے) میں موجود ہے۔ اس تخت پر حضرت داوٗد علیہ السلام اور پھر حضرت سلیمان علیہ السلام کی تاجپوشی ہوئی تھی۔ یہ وہ نکات ہیں جو عیسائیوں اور یہودیوں کے مابین متفق علیہ ہیں۔ البتہ عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق جب مذکورہ بالا کام ہو جائیں گے تو حضرت مسیح علیہ السلام دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے اور اس تخت پر بیٹھ کر حکومت کریں گے۔ اس کے برعکس یہودیوں کے عقیدہ کے مطابق ان کا ''میسایاح'' (Messiah) جس کے وہ اب تک منتظر ہیں' جب آئے گا تو پورے کرۂ ارض پر اس کی حکومت قائم ہو جائے گی۔ حالانکہ اس ضمن میں جو پیشین گوئیاں تورات میں تھیں ان کے مصداق حضرت مسیحؑ تھے' لیکن جب وہ آئے تو یہودیوں نے انہیں تسلیم نہیں کیا' بلکہ نعوذ باللہ انہیں ولد الزنا' جادوگر اور کافر و مرتد قرار دے کر اپنے بس پڑتے سولی پر چڑھا دیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ آسمان پر اٹھا لیا۔

بہرحال یہودیوں کے مذکورہ بالا پروگرام کو پروٹسٹنٹ عیسائیوں کی مکمل حمایت

حاصل ہے۔ خاص طور پر Baptists اور اُن میں سے بھی بالخصوص Evangelists اس مشن میں یہود کے دست و بازو بنے ہوئے ہیں۔ بلی گراہم (Billy Graham) ان کا ایک بہت بڑا مبلغ اور امپر ووائزر تھا' جو خدا کا سفیر (Ambassador of God) کہلاتا تھا اور سابقہ امریکی صدر بش سینئر اس کا مرید تھا' اور اِس وقت موجودہ امریکی صدر بش جونیئر اِس بلی گراہم کے بیٹے (فرینکلن گراہم) کا مرید ہے۔ یہ لوگ (Evangelists) اِس وقت پروٹسٹنٹ عیسائیوں میں سب سے زیادہ فعّال اور بائبل کی نشر و اشاعت اور تشریح و توضیح کرنے والے ہیں۔ ان کے بعض شعلہ بیان مقررین نے اپنے ریڈیو اور ٹی وی کے ذاتی چینلز کا وسیع جال پھیلایا ہوا ہے۔ The Philadelphia Trumpet ان کا ترجمان رسالہ ہے جو فلاڈلفیا سے نکلتا ہے۔ یہ رسالہ پوپ جان پال ثانی کے بارے میں لکھتا تھا کہ یہ شیطان ہے جو کروسیڈ کی تیاری کر رہا ہے۔

تو یہ ہے وہ آخری صلیبی جنگ جس کے لیے یہ بساط بچھائی جارہی ہے اور اس کی خبریں دی ہیں محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ رومی (عیسائی) تم پر اَسّی علم لے کر حملہ آور ہوں گے اور اُن میں ہر علم کے نیچے بارہ ہزار فوجی ہوں گے۔ اس ضمن میں یہ امر انتہائی اہمیت اور دلچسپی کا حامل ہے کہ موجودہ دَور میں ایک ڈویژن آرمی بارہ ہزار فوجیوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ گویا ۸۰ ڈویژن فوج سے حملہ ہوگا جس کے لیے تیاریاں جاری ہیں۔ واضح رہے کہ پہلی صلیبی جنگوں میں عیسائی ایک طرف تھے اور ان کا نشانہ مسلمان اور یہودی تھے' لیکن اب عیسائی اور یہودی ایک ہوں گے اور ان کا نشانہ مسلمان ہوں گے۔ مسلمانوں کو بہت شدید جانی نقصان اٹھانا پڑے گا۔ اس کی خبریں ہمیں رسول اللہ ﷺ نے دی ہیں۔ آپ ﷺ نے اس جنگ (**الملحمة العظمٰی**) کے بارے میں بتایا کہ ایک باپ کے اگر سو بیٹے ہوں گے تو ۹۹ ہلاک ہو جائیں گے' صرف ایک بچے گا۔ ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ اتنی لاشیں گریں گی کہ پوری زمین پٹ جائے گی۔ ایک پرندہ مسلسل اڑتا چلا جائے گا' لیکن اسے زمین پر بیٹھنے

کے لیے خالی جگہ نہیں ملے گی۔ یہ ہے تباہی کا وہ نقشہ جو آخری صلیبی جنگ کے نتیجے میں سامنے آئے گا۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ جنگ اصلاً پچھلی صدی کے اوائل میں شروع ہوئی ہے۔ آج جو صورت حال ہمارے سامنے ہے اس کے مطابق یہودیت اور عیسائیت یک جان ہیں' بلکہ عیسائی یہودیوں کے آلۂ کار بن چکے ہیں۔ لیکن اُمت مسلمہ انتشار کا شکار ہے۔ وحدتِ ملی کہیں نظر نہیں آ رہی۔ اس سارے تناظر میں مسلمان حکمرانوں کا کردار انتہائی مایوس کن بلکہ شرمناک ہے' خواہ وہ وردی والے ہوں یا بغیر وردی کے' سب کے سب مغربی تہذیب کے دلدادہ اور امریکہ کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہیں۔ ہمارے حکمرانوں کی اس کمزوری کی بنا پر امریکہ کا اُن پر شدید دباؤ ہے کہ اسرائیل کو تسلیم کیا جائے۔ محسوس یہی ہو رہا ہے کہ اس مطالبے پر بالآخر سرِ تسلیم خم ہو جائے گا۔ استنبول میں پاکستانی وزیر خارجہ خورشید محمود قصوری اور اسرائیلی وزیر خارجہ شلوم کی pre-arranged ملاقات اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ جبکہ یہودیوں کے توسیع پسندانہ عزائم کسی سے مخفی نہیں ہیں۔ وہ ایک طرف مسلم ممالک پر قبضہ جمانے اور گریٹر اسرائیل کے قیام کے خواب دیکھ رہے ہیں اور دوسری طرف مسلمانوں کے مقدس مقامات قبۃ الصخرہ اور مسجد اقصیٰ کو منہدم کر کے اپنے تیسرے معبد کی تعمیر کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ یہودیوں کے اس اقدام پر جو عظیم خونریزی ہو گی اس کے ہلکے سے تصور سے بھی انسان کانپ جاتا ہے۔ قبۃ الصخرۃ یا مسجد اقصیٰ کے انہدام پر عرب نوجوانوں کے اندر انتہائی جوش وخروش پیدا ہو جائے گا اور وہ بلبلا کر اٹھیں گے۔ اس کے نتیجے میں پہلے تو خود امریکہ کے ایجنٹ مسلم حکمران ان کی سرکوبی کریں گے' جیسے آج ''القاعدہ'' کا نام دے کر پوری مسلم دنیا میں مجاہدین کا قلع قمع کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اس کے بعد انتہائی خوفناک جنگ ہو گی جس میں شدید خونریزی ہو گی۔ اس میں مسلمان ایک طرف ہوں گے اور یہود و نصاریٰ دوسری طرف۔

قرآن مجید میں یہودیوں اور عیسائیوں کے بارے میں جو آیات آئی ہیں' ان

میں دو مقامات پر بظاہر تضاد نظر آتا ہے۔ یہ دونوں مقامات سورۃ المائدۃ میں ہیں۔ ایک مقام پر فرمایا گیا:

﴿لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿٨٢﴾﴾

''تم اہل ایمان کی عداوت میں شدید ترین یہود اور مشرکین کو پاؤ گے' اور ایمان لانے والوں کے لیے دوستی میں قریب ترین اُن لوگوں کو پاؤ گے جنہوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ ان میں عبادت گزار عالم اور تارک الدنیا فقیر پائے جاتے ہیں اور ان میں غرورِ نفس نہیں ہے''۔

یہ وہ دَور تھا کہ جب عیسائیوں اور یہود کے درمیان دشمنی چل رہی تھی' اُس وقت عیسائی مسلمانوں کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت نجاشیؓ ایمان لے آئے' اور آپ کو معلوم ہے کہ شہنشاہِ روم ہرقل (Heraclius) خود بھی اس طرح اسلام لانا چاہتا تھا جس طرح اڑھائی تین سو برس پہلے رومی شہنشاہ قسطنطین عیسائی ہوا تو اس کے ساتھ پوری مملکت عیسائی ہوگئی۔ ہرقل چاہتا تھا کہ میں اسلام لے آؤں اور میرے ساتھ میری مملکت بھی اسلام لے آئے' تاکہ میری بادشاہت قائم رہے۔ چنانچہ اس کی بادشاہت اس کے پاؤں کی بیڑی بن گئی اور وہ اس سعادت سے محروم رہا۔ میرے نزدیک قرآن حکیم کی متذکرہ بالا آیت اُس دَور کی نشاندہی کرتی ہے۔

دوسری آیت وہ ہے جس کی میں نے آغاز میں تلاوت کی تھی:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَاۗءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٥١﴾﴾

''اے ایمان والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا دوست مت بناؤ' یہ آپس ہی میں ایک دوسرے کے دوست (اور ایک دوسرے کے پشت پناہ اور مددگار) ہیں۔ اور اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی پھر انہی میں

ہے‘ یقیناً اللہ ظالموں کی رہنمائی نہیں کرتا‘‘۔

یہ دراصل پیشین گوئی تھی آج کے حالات کے بارے میں۔ ورنہ جس وقت قرآن نازل ہورہا تھا اُس وقت تو یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان شدید دشمنی تھی۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۱۳ ملاحظہ کیجیے:

﴿وَقَالَتِ الۡيَهُوۡدُ لَيۡسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَىۡءٍ ۖ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَـيۡسَتِ الۡيَهُوۡدُ عَلٰى شَىۡءٍ ۖ ......﴾

’’اور یہودی کہتے ہیں کہ عیسائیوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور عیسائی کہتے ہیں کہ یہودیوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے......‘‘

ان کے درمیان ہمیشہ جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ اصحاب الاُخدود عیسائی تھے‘ جنہیں ایک یہودی بادشاہ نے خندقیں کھود کر اُن میں آگ جلا کر انہیں زندہ جلا ڈالا۔ تو ان کے مابین شدید دشمنی اور عداوت تھی‘ لیکن اب برعکس صورت حال ہے کہ ان کے مابین شدید دوستی ہے جس کو آپ کہتے ہیں: ’’hand in glove‘‘ کہ جیسے ہاتھ کے اوپر دستانہ پہن لیں تو پورا ہاتھ اور دستانہ یکجان ہو جاتے ہیں‘ اسی طرح آج یہودیت اور عیسائیت یکجان ہے۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اصل حقیقت یہ ہے کہ عیسائیت یہودیت کے مقاصد پورا کرنے میں اس کا آلۂ کار بن چکی ہے۔ اس صورت حال میں ہمارے لیے راہنمائی سورۃ المائدۃ کی آیت ۵۱ میں ہے‘ جس کا ابھی ہم نے مطالعہ کیا۔ اس سے اگلی آیت میں ارشاد ہے:

﴿ فَتَرَى الَّذِيۡنَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوۡنَ فِيۡهِمۡ يَقُوۡلُوۡنَ نَخۡشٰٓى اَنۡ تُصِيۡبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ﴾

’’تم دیکھتے ہو کہ جن کے دلوں میں روگ ہے وہ ان ہی (یہود ونصاریٰ) میں دوڑ دھوپ کرتے پھرتے ہیں‘ کہتے ہیں کہ ہمیں ڈر لگتا ہے کہ ہم کسی مصیبت کے چکر میں نہ پھنس جائیں‘‘۔

دیکھئے یہ آیت عالم اسلام کے موجودہ حکمرانوں پر کس درجے صادق آرہی ہے! اس وقت عالم اسلام کے اکثر حکمران (جن کے لیے بادشاہ کا لفظ موزوں تر ہے) سب کے

سب بش کے پرستار ہیں۔ پرویز مشرف صاحب نے بھی اب بش کے سامنے تیسرا سجدہ کیا ہے۔ انہوں نے پہلا سجدہ کیا تھا جب طالبان کے بارے میں یوٹرن لیا تھا۔ ایک حکومت کو خود سپانسر کیا' اس کی پشت پناہی کی اور اُن کا سفیر ملا ضعیف ابھی اسلام آباد میں موجود تھا' لیکن ان کے خلاف امریکہ کی پوری مدد کی اور انہیں تہس نہس کرنے میں اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ صدر مشرف کا دوسرا سجدہ کشمیر کے مسئلے پر یوٹرن تھا۔ ہمارا موقف ہمیشہ یہ رہا ہے کہ پہلے مسئلہ کشمیر پر بات ہوگی' پھر کوئی اور بات ہوگی۔ چنانچہ واجپائی کے دَور میں صدر مشرف صاحب گردن اکڑا کر دہلی سے واپس چلے آئے تھے کہ پہلے کشمیر کی بات ہوگی' پہلے کشمیر کا مسئلہ حل کرو' اس کے بعد پھر کوئی بات ہوگی۔ اب اس ایشو پر بھی ہم نے سجدۂ سہو کر لیا اور ہم لچک پر لچک دکھائے چلے جا رہے ہیں۔ ان کی طرف سے ایک لچک بھی نہیں آئی۔ وہ کہتے ہیں کہ سرحدوں کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں ہوسکتی' ہندوستان کی سرحد ہندوستان کی سرحد ہے اور کشمیر ہندوستان کا اٹوٹ انگ ہے۔

اب ہمارے صدر صاحب نے تیسرا سجدہ اسرائیل کو تسلیم کرنے کے بارے میں کیا ہے۔ اسرائیل کے بارے میں ہمارا ہمیشہ سے یہ موقف تھا کہ ہم ہرگز اسے تسلیم نہیں کریں گے' چاہے عرب تسلیم بھی کر لیں۔ بانیٔ پاکستان نے اسرائیل کو مغربی دنیا کی ناجائز (illegitimate) اولاد قرار دیا تھا' اور اگر عرب مجبوراً ایک ناجائز ملک کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں تو ضروری تو نہیں کہ ہم بھی مجبوری کے تحت اسے قبول کریں۔ لیکن اب یہ صورت حال زیادہ دُور معلوم نہیں ہو رہی کہ یہ تیسرا سجدہ مکمل ہو جائے گا اور اسرائیل کو تسلیم کر لیا جائے گا۔ اس لیے کہ ہمارے اپنے ملک کے اندر کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جو حکومتی اقدامات کو چیلنج کر سکے۔ زیادہ سے زیادہ اگر کوئی قابل ذکر جماعتیں تھیں تو وہ جماعت اسلامی اور جمعیت علماء اسلام تھیں۔ ان دونوں کے پاؤں میں ڈیڑھ صوبائی حکومتیں دے کر بیڑیاں ڈال دی گئی ہیں اور انہیں ان کے اندر مگن کر دیا گیا ہے۔ اب وہ صدر مشرف کے خلاف کوئی سٹینڈ لینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ بہرحال اِس وقت صورت حال یہ ہے کہ ہم نے قرآنی ہدایات کو نظر انداز کرتے ہوئے بش کو

تیسری مرتبہ سجدہ کرلیا ہے اور عیسائیوں کے بعد اب ہم یہودیوں سے بھی دوستی کے لیے بے تاب نظر آ رہے ہیں۔ حالانکہ قائداعظم نے جو اِس ملک کے بانی ومؤسس ہیں' دوٹوک انداز میں اسرائیل کو مغربی قوتوں کا حرامی بچہ قرار دیا تھا اور فرمایا تھا کہ اسے ہم کبھی بھی تسلیم نہیں کریں گے۔ اسی طرح ہمارے پہلے وزیراعظم خان لیاقت علی خان جب امریکہ گئے تھے تو انہیں وہاں یہودیوں کی طرف سے بہت بڑا reception دیا گیا' جس میں اسرائیل کو تسلیم کر لینے کی صورت میں طرح طرح کے لالچ دیے گئے۔ لیکن ان کے جواب میں خان لیاقت علی خان مرحوم نے کہا تھا (اللہ تعالیٰ اُن پر اپنی رحمتیں نازل کرے)

"Gentlemen, our souls are not for sale."

''حضرات! ہماری روحیں بکاؤ مال نہیں ہیں''۔

آپ یہ قیمت دے کر' لالچ دے کر ہمیں ایک غلط کام پر آمادہ نہیں کر سکتے' ہم اسرائیل کو تسلیم نہیں کریں گے۔ اس واقعے کو ۵۵ برس ہو چکے ہیں اور اب محسوس ہو رہا ہے کہ شاید ہماری حکومت اسرائیل کو تسلیم کرنے اور اس کے ساتھ باقاعدہ ریاستی تعلقات کے قیام کی راہ پر گامزن ہے۔ لیکن ہمیں یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہیے کہ یہود ونصاریٰ کی دوستی ہمارے لیے کبھی نفع بخش نہیں ہوسکتی۔ اس ضمن میں قرآنی ہدایت ہمیشہ ہمارے پیشِ نظر رہنی چاہیے:

''اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو اپنا رفیق کبھی نہ بناؤ۔ وہ آپس میں ہی ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ اور جو کوئی ان سے رشتۂ ولایت استوار کرے گا وہ انہی میں سے ہوگا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ظالموں کو راہ یاب نہیں کیا کرتا۔''

یہ تھی وہ ساری صورتحال جس کا ایک جائزہ میں نے آپ کے سامنے رکھ دیا ہے کہ آخری صلیبی جنگ کے معاملات کس طرح قدم بقدم آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان مایوس کن حالات میں ہمیں امریکہ کے سامنے سجدہ ریز ہونے کی بجائے اپنے مالکِ حقیقی سے نصرت واعانت کا طلب گار رہنا چاہیے۔

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

حقیقت واقسامِ شرک (۴)

بانئ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولہِ الکریم ...... امّا بَعد:

اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیم۔ بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

﴿وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِہٖ وَھُوَ یَعِظُہٗ یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِکْ بِاللّٰہِ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ﴿۱۳﴾﴾ (لقمٰن) ...... صدق اللّٰہ العظیم

''اور یاد کرو جب کہ لقمان نے کہا اپنے بیٹے سے' اور وہ اسے نصیحت کر رہے تھے' کہ اے میرے بچے! اللہ کے ساتھ شرک نہ کیجیو' یقیناً شرک بہت بڑا ظلم (اور بہت بڑی ناانصافی) ہے''۔

گزشتہ نشست میں ہم نے ''شرک فی الصفات'' کے ذیل میں دورِ جدید کے سب سے بڑے شرک یعنی ''شرک فی التوکل'' یا مادہ پرستی کے شرک پر گفتگو کا آغاز کیا تھا۔ چنانچہ عرض کیا گیا تھا کہ انسان کا اولاً اپنی صلاحیتوں' اپنی قوتوں اور اپنی ذہانت پر اعتماد کہ میں نے ہی یہ سب کچھ کیا ہے اور یہ میری صلاحیتوں کا ظہور اور میرے کام کا نتیجہ ہے' پھر جو کچھ بھی مادی اسباب و وسائل جمع ہوں ان پر انسان کا توکل اور بھروسہ کہ میں نے جو کچھ ساز و سامان اور اسباب و وسائل فراہم کر لیے ہیں ان سے یہ یہ نتائج لازماً نکل کر رہیں گے' انسان کی یہ ذہنی روش (mental attitude) اور اس کے سوچنے کا یہ انداز دراصل ''شرک فی التوکل'' ہے۔ اس ضمن میں سورۂ بنی اسرائیل آیت ۲ اور سورۃ الکہف آیات ۲۳' ۲۴ کا حوالہ دیا گیا تھا۔

اس کے علاوہ سورۃ الکہف کے پانچویں رکوع میں اس شرک کی مختلف پہلوؤں

سے وضاحت ہوئی ہے۔ اس میں دو اشخاص کا مکالمہ بڑی تفصیل سے نقل ہوا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ واقعہ ہوا ور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ تمثیلی پیرایہ ہو۔ ان دو اشخاص میں سے ایک درویشِ خدا مست تھا۔ اس کے پاس دنیاوی اسباب و وسائل اور مال و دولت نہیں تھی، لیکن اللہ پر اس کا کامل یقین اور توکل تھا۔ وہ معرفتِ خداوندی اور اللہ پر ایمان سے سرشار تھا، جبکہ دوسرا سرمایہ دارِ مال مست تھا۔ قرآن مجید میں یہ واقعہ بایں الفاظ بیان ہوا ہے:

﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ﴿۳۲﴾ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْئًا وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ﴿۳۳﴾ وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ﴾

''اور (اے نبیؐ!) ان کے سامنے مثال بیان کیجیے دو اشخاص کی، ان میں سے ایک کو ہم نے انگور کے دو باغ دیے اور ان کے گرد کھجور کے درختوں کی باڑ لگائی اور اُن کے درمیان کاشت کی زمین رکھی۔ (یعنی پھل کے ساتھ ساتھ اجناس بھی پیدا ہو رہی تھیں) دونوں باغ خوب پھلے پھولے اور بار آور ہونے میں انہوں نے ذرا سی کسر بھی نہ چھوڑی اور ان باغوں کے اندر ہم نے ایک نہر جاری کر دی (یعنی آب پاشی کا نظام بھی موجود تھا اور باغ کبھی سوکھا نہیں تھا)۔ مزید یہ کہ اس کا ثمر بھی تھا''۔ [اس سے یہ مراد بھی لی گئی ہے کہ وہ صاحب اولاد بھی تھا اور یہ بھی کہ باغ پھلوں سے لدا پھندا تھا]

﴿فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ﴿۳۴﴾﴾

''پس اس نے اپنے ساتھی (درویشِ خدا مست) سے کہا جو کہ اُس سے ہم کلام تھا (خیر اور بھلائی کی کوئی بات کر رہا تھا، کچھ خوفِ خدا دلا رہا تھا) کہ میں تجھ سے زیادہ مال دار ہوں اور تجھ سے زیادہ طاقت ور نفری رکھتا ہوں''۔

یعنی اس کا دُنیوی مال و متاع اور اسباب و وسائل پر مکمل بھروسہ ہو گیا۔ آج کل کے زمانے میں یوں سمجھئے کہ کسی شخص کے پاس دو بڑی بڑی ملیں (mills) ہوں اور اس نے ایک بڑا فارم بھی لگایا ہوا ہو۔ آب پاشی کے لیے بھی اس کا اپنا نظام ہو اور بجلی کے لیے واپڈا پر انحصار کرنے کے بجائے اس نے اپنا ہی دیوقامت جنریٹر لگا لیا ہو اور دو

سال تک کے لیے ڈیزل بھی مہیا کر رکھا ہو‘ تو اُس شخص کے دل میں جو خناس پیدا ہوگا وہ اُس سرمایہ دارِ مال مست کے دل میں پیدا ہو گیا تھا‘ لہٰذا اُس درویشِ خدا مست کے جواب میں اُس نے کہا: ’’میں تجھ سے زیادہ مال دار ہوں اور تجھ سے زیادہ طاقت ور نفری رکھتا ہوں۔‘‘ تم خود تو جوتیاں چٹخارتے پھرتے ہو اور ہمیں آئے ہو نصیحت کرنے! ہمارے پاس یہ جو مال و متاع اور ساز و سامان ہے آخر یوں ہی تو نہیں ہمیں مل گیا! آخر ہمارے اندر کچھ ذہانت و فطانت ہے‘ ہم نے کچھ سوچا اور محنت کی ہے‘ تب ہی تو یہ چیزیں ہمیں حاصل ہوئی ہیں!

آگے فرمایا: ﴿وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ج﴾ ’’اور (یہ کہتے ہوئے) وہ اپنے باغ میں داخل ہوا جبکہ وہ اپنے اوپر ظلم کر رہا تھا‘‘۔ جب اس نے باغ کا لہلہاتا ہوا منظر دیکھا تو اس کا نشہ دوآتشہ ہو گیا اور اس کے دل میں ایک خناس سا پیدا ہو گیا۔﴿قَالَ مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا ﴿٣٥﴾ وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ﴾ ’’اس نے کہا: میں نہیں سمجھتا کہ میرا یہ باغ کبھی بھی تباہ ہوسکتا ہے‘ اور مجھے توقع نہیں کہ قیامت کی گھڑی کبھی آئے گی‘‘۔ تم خواہ مخواہ مجھے خدا سے اور بُرے انجام سے ڈراتے ہو۔

دیکھئے یہ تھا وہ جہل مرکب جو اُس کے اندر پیدا ہوا۔ اس کے اعتقادات و نظریات میں کہیں بھی کسی دیوی دیوتا کا ذکر نہیں ہے۔ ذکر ہے تو اسباب و وسائل اور دُنیوی ساز و سامان کا ہے۔ اُس نے کہیں یہ نہیں کہا کہ یہ فلاں دیوی کا مجھ پر کرم ہے اور فلاں دیوتا کی مجھ پر کرپا ہے۔ بلکہ اس کے اگلے الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ماننے والا ایک ربّ ہی کا ہے۔ ﴿وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ﴿٣٦﴾﴾ ’’تاہم اگر کبھی مجھے اپنے ربّ کے حضور لوٹایا بھی گیا تو میں ضرور اس سے بھی زیادہ شاندار جگہ پاؤں گا‘‘۔ جب میرے اندر یہ صلاحیتیں ہیں کہ مجھے یہاں اتنا کچھ ملا ہے تو وہاں اس سے بڑھ کر ملے گا۔ تم یہاں جوتیاں چٹخار رہے ہو تو وہاں بھی جوتیاں چٹخارو گے۔ یہ ہے اس کا وہ خناس جو ظاہر ہوا۔

اب اُس بندۂ خدا کا جواب ملاحظہ فرمائیے: ﴿قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ

اَکَفَرۡتَ بِالَّذِیۡ خَلَقَکَ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ مِنۡ نُّطۡفَۃٍ ثُمَّ سَوّٰٮکَ رَجُلًا ﴿۳۷﴾ ''اُس (درویشِ خدا مست) نے اُس (سرمایہ دارِ مال مست) سے کہا جو اُس سے ہم کلام تھا کہ کیا تو نے کفر کیا اُس ذات کا جس نے تجھے مٹی سے' پھر نطفے سے پیدا کیا' پھر تجھے ایک مکمل انسان بنا دیا؟'' ﴿لٰکِنَّا۠ ہُوَ اللّٰہُ رَبِّیۡ وَ لَاۤ اُشۡرِکُ بِرَبِّیۡۤ اَحَدًا ﴿۳۸﴾ ''لیکن میرا ربّ تو وہی اللہ ہے (میں تو اس ایک ہی ربّ کا ماننے والا ہوں) اور میں اپنے ربّ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا''۔ ﴿وَ لَوۡ لَاۤ اِذۡ دَخَلۡتَ جَنَّتَکَ قُلۡتَ مَا شَآءَ اللّٰہُ ۙ لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ ۚ﴾ ''اور (اے بدبخت!) یہ کیوں نہ ہوا کہ تو جب اپنے باغ میں داخل ہوا تھا تو کہتا جو کچھ اللہ چاہے (وہی ہوگا) کوئی زور نہیں (نہ میرا نہ کسی اور کا) مگر اللہ ہی کی توفیق و تائید سے''۔

یہ ''ماشاء اللہ'' کیا ہے؟ یہ کہ انسان کوئی سہانا منظر اور نعمت وغیرہ دیکھے اور سمجھے کہ یہ سب کچھ اللہ کی مشیت کا ظہور ہے' اس کا کرم اور مہربانی ہے' اسی کی دین ہے' یہ میری قوتوں' میری صلاحیتوں اور میری توانائیوں کا ظہور نہیں ہے! یہ ہے اصل میں توحید کہ اگر آپ کہیں گھر میں داخل ہوں اور وہاں آپ کو کوئی اچھا منظر نظر آئے' بچے کھیل رہے ہوں' گھر کے اندر خوشی کا ماحول ہو' ایک ہنستا بستا ہرا بھرا گھر ہو تو فوراً زبان سے نکلنا چاہیے ''ماشاء اللہ''۔ نگاہ کہیں اسباب و وسائل کی طرف منتقل نہ ہو جائے' بلکہ نگاہ کو ایک ہی زقند میں پہنچنا چاہیے مُسبّب الاسباب تک کہ وہ ہے جس کے فضل کا یہ ظہور ہے' یہ کسی اور کی کوئی مہارت' کاریگری' ہوشیاری اور کسی اور کی ذہانت و فطانت نہیں ہے۔

اس درویشِ خدا مست نے پھر کہا: ﴿اِنۡ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنۡکَ مَالًا وَّ وَلَدًا ﴿ۚ۳۹﴾ فَعَسٰی رَبِّیۡۤ اَنۡ یُّؤۡتِیَنِ خَیۡرًا مِّنۡ جَنَّتِکَ وَ یُرۡسِلَ عَلَیۡہَا حُسۡبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصۡبِحَ صَعِیۡدًا زَلَقًا ﴿ۙ۴۰﴾ اَوۡ یُصۡبِحَ مَآؤُہَا غَوۡرًا فَلَنۡ تَسۡتَطِیۡعَ لَہٗ طَلَبًا ﴿۴۱﴾ ''اگر تو مجھے مال اور اولاد میں اپنے سے کمتر پا رہا ہے' تو مجھے یقین ہے کہ میرا ربّ (اگر چاہے تو) مجھے تیرے باغ سے بہتر باغ عطا کر دے اور (تیرے) اس (باغ) پر آسمان سے کوئی آفت بھیج دے کہ وہ چٹیل میدان بن کر رہ جائے (جہاں خاک اڑ

3

رہی ہو)۔ یا اس کا پانی زمین کے اندر اتر جائے اور تو (کسی طرح سے بھی) پانی کو کھینچ کر نہ لا سکے''۔

یہ وہ درویشِ خدامست کی بات تھی جو اُس کی زبان سے نکلی۔ نبی اکرمﷺ نے فرمایا: ((رُبَّ اَشْعَثَ مَدْفُوْعٍ بِالْاَبْوَابِ لَوْ اَقْسَمَ عَلَی اللّٰہِ لَاَبَرَّہٗ)) [1] یعنی ''اللہ کے کچھ بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جو اگرچہ پراگندہ بالوں والے ہوتے ہیں' دروازوں سے ان کو دھتکار دیا جاتا ہے' لیکن اگر وہ کسی بات پر قسم کھا بیٹھیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کی لاج رکھتا ہے''۔اور یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔﴿وَاُحِیْطَ بِثَمَرِہٖ﴾ ''اور کھینچ لیا گیا (ختم کر دیا گیا) اس کا سارا ثمر''۔ ہوسکتا ہے کوئی ایسی وبا آئی ہو کہ ساری اولاد بھی ہلاک ہوگئی ہو اور کوئی ایک ایسا بگولا آیا ہو جو اُس کے پورے کے پورے باغ کو جھلسا کر چلا گیا ہو۔﴿فَاَصْبَحَ یُقَلِّبُ کَفَّیْہِ عَلٰی مَآ اَنْفَقَ فِیْھَا وَھِیَ خَاوِیَۃٌ عَلٰی عُرُوْشِھَا﴾ ''اب وہ باغ پر اپنی لگائی ہوئی لاگت پر اپنی ہتھیلیاں ملتا رہ گیا' جبکہ وہ اپنی ٹٹیوں پر الٹا پڑا ہوا تھا''۔ یعنی اس بات پر افسوس کہ میری ساری عمر کی محنت اور کمائی اس پر لگی ہوئی تھی اور یہ چشم زدن میں ختم ہوگئی۔﴿وَیَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُشْرِکْ بِرَبِّیْٓ اَحَدًا﴾ ''اور وہ کہنے لگا کاش کہ میں نے اپنے ربّ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا ہوتا!''

اب یہاں دیکھئے کہ یہ کون سا شرک مراد ہے؟ اس پورے واقعہ میں کسی بعل کا' کسی دیوی یا دیوتا کا اور کسی لات ومنات اور عزیٰ کا کوئی ذکر نہیں۔ ذکر ہے تو ربّ کا ہے کہ ﴿وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰی رَبِّیْ﴾ ''اور اگر کبھی میں اپنے ربّ کی طرف لوٹا دیا گیا......'' یہ اصل میں مادے اور اسباب و وسائل پر توکل ہے' اپنی توانائیوں' ذہانت' دُور اندیشی اور معاملہ فہمی کا گھمنڈ ہے جسے مذکورہ بالا رکوع میں شرک سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ مادہ پرستی کا شرک ہے جو پہلے شاید شاذ ہوتا ہو' لیکن آج کائناتی (universal) ہے۔ سائنس اسی بنیاد پر پروان چڑھی اور اُبھری ہے۔ یہ اس کائنات کے تمام مظاہر فطرت (phenomena) کو ایسے بیان کرتی ہے کہ یہ خودکار نظام ہے اور اس میں طبیعی قوانین عمل پیرا ہیں۔ مثلاً بھاپ اٹھی' ہوا اُسے اِدھر

(۱) صحیح مسلم' کتاب البر والصلۃ والآداب' باب فضل الضعفاء والخاملین۔ عن ابی ھریرۃؓ۔

سے اُدھر لے گئی‘ بادل بنے اور بارش برسی۔ اس میں کہیں خدا کی مشیت‘ خدا کے ارادہ‘ خدا کے اِذن کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس کا مجموعی اثر یہ ہوا ہے کہ اگر خدا کا اقرار ہے بھی تو محض اس حد تک کہ وہ معاذ اللہ کسی کونے میں بیٹھ گیا ہے اور یہ کائنات خود بخود چل رہی ہے۔ ہمارا سارا توکل اور اعتماد مادی اسباب و وسائل پر ہے۔ اور اس شرک فی التوکل یا مادہ پرستی کے شرک میں کم وبیش ہم میں سے ہر شخص مبتلا ہے۔

اس کو ایک حدیث کے حوالے سے سمجھئے۔ نبی اکرمﷺ نے ایک مرتبہ زُہد کی تعریف اس طرح بیان فرمائی کہ:

((اَلزَّهَادَةُ فِی الدُّنْیَا لَیْسَتْ بِتَحْرِیْمِ الْحَلَالِ وَلَا اِضَاعَةِ الْمَالِ وَلٰـکِنَّ الزَّهَادَةَ فِی الدُّنْیَا اَنْ لَا تَکُوْنَ بِمَا فِیْ یَدَیْکَ اَوْثَقَ مِمَّا فِیْ یَدَیِ اللّٰہِ))(۱)

”دنیا میں زہد (اپنے اوپر) حلال کو حرام کر لینے اور مال و دولت کو ضائع کرنے کا نام نہیں ہے‘ بلکہ دنیا میں زہد تو یہ ہے کہ جو کچھ تمہارے ہاتھوں میں ہے اس پر تمہارا توکل اور اعتماد زیادہ نہ ہو جائے اس چیز سے جو اللہ کے ہاتھ میں ہے“۔

یعنی تم عام طور پر سمجھتے ہو کہ حلال چیزوں کو بھی اپنے اوپر حرام ٹھہرا لیا جائے تو یہ زہد ہے‘ یعنی نہ اچھا کھانا‘ نہ اچھا پہننا‘ حالانکہ اللہ نے یہ چیزیں حلال کی ہیں۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْۤ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ﴾ (الاعراف:۳۲)

”(اے نبیؐ!) کہہ دیجیے کس نے اللہ کی اُس زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور خدا کی بخشی ہوئی پاک چیزیں (ممنوع کر دیں)؟“

بلکہ زُہد تو یہ ہے کہ جو کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے اس پر تمہارا وثوق‘ اعتماد اور توکل زیادہ ہو جائے اس سے کہ جو تمہارے ہاتھ میں ہے‘ یعنی اسباب و وسائل اور دولت وغیرہ۔ لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ جیب میں پیسہ ہے تو دل کو سکون ہے‘ جیب میں پیسہ نہیں تو دل اڑا ہوا ہے‘ اس لیے کہ اللہ کے خزانوں پر‘ اللہ کی رزّاقیت اور قدرت پر ہمارا اتنا اعتماد اور یقین نہیں جتنا کہ پیسے پر ہے‘ بلکہ اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔ اب اسے شرک کہہ لیں یا کفر کہہ

(۱) سنن الترمذی‘ کتاب الزهد عن رسول اللهﷺ‘ باب ما جاء فی الزهادة فی الدنیا۔

لیں۔ جیسے ایک درویش نے کہا ہے: ''جو دم غافل سو دم کافر'' کہ انسان کا جو سانس غفلت میں بسر ہوتا ہے تو درحقیقت اس کا وہ وقت ایک نوع کے کفر میں گزرتا ہے۔ علامہ اقبال نے کتنی خوبصورت بات کہی ہے ؎

بُتوں سے تجھ کو امیدیں' خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

دیکھئے نبی اکرمﷺ نے توحید کی کتنی تلقین کی ہے! آپؐ نے اپنے چچازاد بھائی حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو تاکید فرمائی کہ اس بات کو ذہن نشین کرلو کہ ''اگر تمام انسان مل کر تجھے کوئی نفع پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے مگر وہی کچھ جو اللہ نے تمہارے حق میں لکھ دیا ہے' اور تمام انسان مل کر اگر تجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے مگر وہی کچھ جو اللہ نے تمہارے خلاف لکھ دیا ہے۔''(۱) جب تک انسان کے اندر یہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی کہ تمام بیم و رجاء کا مرکز اللہ کی ذات ہو جائے' ماسویٰ اللہ سے امید اور خوف دونوں منقطع ہو جائیں تو گویا اصل توحید حاصل نہیں۔ توحید کا نام ہی تو ولایتِ خداوندی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿اَلَآ اِنَّ اَوۡلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿ۚ۶۲﴾﴾ (یونس) ''سنو! جو اللہ کے دوست ہیں ان کے لیے یقیناً کسی خوف اور غم کا موقع نہیں ہے''۔ ان کی امیدیں اور ان کا خوف سب ماسویٰ اللہ سے کٹ کر اللہ کی ذات پر مرتکز ہو جاتا ہے۔ امید ہے تو اللہ سے اور خوف ہے تو اللہ سے۔ اُن کا ایمان اور یقین ہوتا ہے کہ کسی اور کے کیے کچھ نہیں ہوسکتا جب تک اللہ نہ چاہے۔ کوئی میری بگڑی نہیں بنا سکتا جب تک کہ اللہ نہ چاہے' کوئی میری تکلیف رفع نہیں کرسکتا اگر اللہ نہ چاہے۔ تو خوف اور امید دونوں جب تک جملہ مخلوقات سے منقطع ہو کر اللہ کی ذات سے منسلک نہ ہو جائیں انسان توحید کا لذت آشنا نہیں ہوسکتا۔ آج کا انسان اس مادہ پرستانہ فکر کی وجہ سے اس سے بہت محروم ہو چکا ہے۔ البتہ زبان سے لا الٰہ کہہ دینا آسان ہے' اس میں کوئی مشکل نہیں پڑتی۔

---

(۱) سنن الترمذی' کتاب صفۃ القیامۃ والرقائق والورع۔

بعض مذہبی نزاعات اور ان کا حل

اب آیئے ذرا ''شرک فی الصفات'' کے کچھ دوسرے پہلوؤں کی طرف کہ جن سے بعض مذہبی نزاعات رونما ہوئے ہیں۔ شاید آپ کو ان کا کوئی حل میسر آ جائے۔ صفاتِ باری تعالیٰ کے باب میں ایک بات تو یہ جان لیجیے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے قرآن مجید میں بہت سے الفاظ استعمال ہوئے ہیں بطور صفت بھی اور بطور اسماء بھی۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات میں بہت تھوڑا فرق ہے۔ جب اُس لفظ کو حالت نکرہ میں لاتے ہیں تو وہ اللہ کی صفت ہے اور جب اسے معرّف باللاّم کرتے ہیں تو وہ اللہ کا نام ہے۔ مثلاً ''سمیعٌ'' اللہ کی صفت ہے کہ اللہ سننے والا ہے' جبکہ ''السمیع'' اللہ کا نام ہے۔ ہمیں اللہ تعالیٰ کی معرفت اس کے اسماء وصفات ہی کے حوالے سے حاصل ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں: ''اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَائِہٖ وَصِفَاتِہٖ'' کہ میں اللہ پر ایمان لایا جیسا کہ وہ اپنے اسماء اور صفات سے ظاہر ہے۔ تو ہمارا اللہ کے ساتھ جو ذہنی اور قلبی رشتہ ہے وہ اس کے اسماء وصفات کے حوالے سے ہے۔

قرآن مجید یہ بھی کہتا ہے: ﴿لَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى﴾ ''جتنے اچھے نام ہیں اسی کے ہیں''۔ پھر یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ کے لیے قرآن مجید میں جو نام آ گئے ہیں وہ تو یقیناً اللہ کے ہیں اور جن صفات کا اثبات ہو گیا ہے وہ اللہ کے لیے ثابت ہیں' لیکن چند صفات کو بنیادی قرار دیا گیا ہے کہ بقیہ صفات انہی کی فروع اور شاخیں (corollaries) ہیں۔ مثلاً صفتِ علم اللہ تعالیٰ کی ایک بنیادی صفت ہے اور سمیع' بصیر' لطیف' خبیر' یہ تمام اصل میں علم ہی کے مختلف شعبے اور شاخیں ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ''قدرت'' ہے۔ اب اس کے ذیل میں اللہ تعالیٰ کے بہت سے نام آ جائیں گے' مثلاً: اَلْمُعِزُّ ''عزت دینے والا'' اَلْمُذِلُّ ''ذلیل کرنے والا'' الرَّافِع ''اٹھانے والا'' الْخَافِض ''گرانے والا'' الباسِط ''کشادگی دینے والا'' القَابِض ''تنگی دینے والا'' یہ سب اس کی صفتِ قدرت ہی کی شروح اور اس کی شاخیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی بنیادی صفات یہ ہیں (اگرچہ مختلف علماء' محققین اور متکلمین کے ہاں

5

یہ مختلف ہیں) : (۱) وجود[1] (۲) حیات' (۳) قدرت' (۴) علم' (۵) ارادہ' (۶) کلام۔ وہ الحیّ ہے' زندہ ہے' اس کا وجود حیات والا ہے۔ وہ صاحب قدرت ہے' صاحب علم ہے' صاحب ارادہ ہے' متکلم ہے' کلام کرتا ہے۔ اِن تمام صفات کے ساتھ جب آپ تین چیزیں جوڑ لیں گے کہ اس کی حیات مطلق ہے' اس کی حیات ذاتی ہے اور اس کی حیات قدیم ہے تو یہ توحید ہے۔ اور اگر مطلق ہونے میں' قدیم ہونے میں اور ذاتی ہونے میں کسی اور کو کسی پہلو سے شامل کر لیا گیا تو یہ شرک ہے۔ ماسویٰ اللہ کی حیات ذاتی نہیں عطائی (اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ) ہے' مطلق نہیں مقید اور محدود ہے' قدیم نہیں حادث ہے۔ اگر یہ چیزیں پیشِ نظر رہیں تو توحید میں کوئی خلل نہیں آئے گا۔ لیکن اگر ان میں سے کسی ایک چیز کو کسی ایک پہلو سے مجروح کر دیا گیا تو یہ شرک بن جائے گا۔

اب جان لیجیے کہ علم کے بارے میں توحید کیا ہے۔ اللہ کا علم ذاتی ہے جبکہ ماسویٰ اللہ کا علم عطائی ہے۔ ماسویٰ میں سب شامل ہیں۔ جب فرشتوں سے کہا گیا کہ بتاؤ ذرا ان چیزوں کے نام تو اُن کا جواب تھا : ﴿سُبۡحٰنَکَ لَا عِلۡمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا﴾ (البقرۃ: ۳۲) ''تو پاک ہے (اے پروردگار!) ہمیں کوئی علم حاصل نہیں سوائے اس کے جو تو نے ہمیں سکھایا (عطا کیا) ہے''۔ تو معلوم ہوا کہ فرشتے ہوں' انبیاء ہوں' رسول ہوں' اولیاء اللہ ہوں' کوئی بڑے سے بڑا اعلیٰ مہٗ فہّامہ ہو' کسے باشد' سب کا علم عطائی ہے ذاتی نہیں' حادث ہے قدیم نہیں' محدود ہے مطلق اور لامتناہی نہیں۔ یہ تینوں قیود اگر موجود ہیں تو شرک نہیں ہے' اور اگر ان میں سے ایک قید بھی ہٹ گئی تو شرک ہو جائے گا۔

مسئلۂ علمِ غیب

اب ذرا ''علم غیب'' کے مسئلے کو حل کر لیجیے! یہ ہمارے ہاں کے مہتم بالشان مسائل میں سے ایک ہے اور اس میں بہت طویل بحثیں اور جھگڑے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو علمِ غیب حاصل ہے یا نہیں؟ ایک طرف سے اس کی پُرزور نفی ہے اور ایک طرف سے

(۱) اللہ تعالیٰ کی صفت ''وجود'' کے بارے میں علماء و محققین اور متکلمین کے ہاں ایک باریک سی بحث ہے کہ ''وجود'' صفت ہے یا نہیں۔

اثبات ہے کہ نبی اکرمﷺ ''**عالمُ الکُل**''اور''**عالم مَا کَانَ وَمَا یَکُوْنُ**'' ہیں۔اور اِن دونوں مکتب ہائے فکر میں جو رسہ کشی ہے وہ دراصل ''علم غیب'' کی تعریف (definition) کا اختلاف ہے۔مجھ میں الحمد للہ معاملے کی تحقیق کا داعیہ ہے کہ کسی بھی معاملے کی اچھی طرح سے تحقیق کر لی جائے' اور یہ اللہ تعالیٰ کے مجھ پر احسانات میں سے ایک احسان ہے۔میں ابھی میڈیکل کالج میں زیر تعلیم تھا کہ ساہیوال میں ایک بریلوی مکتب فکر کے عالم دین کے پاس گیا اور پوچھا کہ علم غیب کے بارے میں کیا اختلاف پایا جاتا ہے اور اس میں آپ کا موقف کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہم نبی اکرمﷺ کے علم کے بارے میں یہ تینوں قیدیں مانتے ہیں کہ آپؐ کا علم ذاتی نہیں عطائی ہے' آپؐ کا علم قدیم نہیں حادث ہے' آپؐ کا علم غیر محدود نہیں محدود ہے۔ بلکہ انہوں نے مجھے اس پر اپنے مکتب فکر کے علماء کی تحریریں دکھائیں کہ ہماری طرف سے ان تینوں باتوں کا برملا اعتراف اور اقرار ہوتا ہے۔اس پر میں نے عرض کیا کہ کم ازکم ان تینوں چیزوں کو اگر تسلیم کیا جائے تو پھر میرا آپ سے کوئی جھگڑا نہیں ہے اور میرے نزدیک اس میں شرک والی بات نہیں ہے۔تو دراصل اختلاف کی وجہ صرف یہ ہے کہ علم غیب کی definition مختلف ہو رہی ہے۔ جو اِس غیب کی نفی کرتے ہیں وہ اسے کسی اور طریقے سے define کرتے ہیں اور جو غیب کا اثبات کرتے ہیں وہ اسے کسی اور طرح سے define کرتے ہیں۔ جو اس کا اثبات کر رہے ہیں وہ بھی درست ہیں اور جو نفی کر رہے ہیں وہ بھی درست ہیں' لیکن ایک جھگڑا ہے کہ حل نہیں ہو رہا ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے لیے جو ''غیب'' کا لفظ کئی بار آیا ہے کہ ﴿**عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ**﴾ ''وہ غیب اور حاضر کا جاننے والا ہے'' تو یہ ہمارے اعتبار سے ہے۔اللہ کے لیے تو کوئی چیز غیب ہے ہی نہیں۔ ہر شے آنِ واحد میں اس کے سامنے حاضر ہے۔اس کے لیے غیب کا کیا سوال ہے! اللہ کے لیے اگر غیب کا تصور بھی آپ کریں گے تو کفر ہو جائے گا۔ جو چیزیں اللہ نے انسانوں کی نگاہ سے اوجھل رکھی ہیں وہ غیب ہیں۔اس لیے کہ ہمیں اس دنیا میں امتحان کے لیے بھیجا گیا ہے۔اگر سارے

حقائق ہماری نگاہوں کے سامنے ہوں تو پھر امتحان کیسا! اگر جنت نگاہوں کے سامنے ہو' دوزخ بھڑکتی نظر آ رہی ہو اور فرشتے نگاہوں کے سامنے موجود ہوں تو کون فرعون' کون نمرود' کون ابوجہل ہوگا جو انکار کرے گا! وہ تو سب کے سب ایمان لے آئیں گے اور پورے پورے مؤمن ہوں گے۔ اس لیے کہ غیب تو پھر شہادہ بن کر سامنے آ جائے گا۔ جبکہ امتحان تو اسی میں ہے کہ مانو ہمیں غیب میں رہتے ہوئے' مانو فرشتوں کو اِس کے باوجود کہ وہ تمہاری نگاہوں سے اوجھل ہیں' مانو جنت اور دوزخ کو اس کے باوجود کہ وہ تمہارے لیے غیب ہیں۔ تو اس لفظ ''غیب'' کو اگر سمجھ لیا جائے تو جھگڑا باقی نہیں رہتا۔

دراصل انسانوں کے علم کے آگے ایک پردہ حائل کر دیا گیا ہے اور علم کو شہادہ اور غیب میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ جس کو نبوت عطا کرتا ہے تو اسے اس غیب والے علم میں سے کچھ حصہ دیتا ہے' تبھی تو وہ نبی بنتا ہے! اگر اس کا علم بھی ہمارے علم کی طرح ہو تو وہ نبی کیسے ہو گیا! اسے تو جنت کی سیر کرائی جاتی ہے جو میرے اور آپ کے لیے غیبِ مطلق ہے۔ اسے دوزخ کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے جو ہمارے لیے غیب ہے۔ فرشتے اس کے سامنے ہوتے ہیں۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام کو ان کی اصل مَلکی شکل میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ دیکھا ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ﴿۱۳﴾ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ﴿۱۴﴾ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ﴿۱۵﴾ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ﴿۱۶﴾ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ﴿۱۷﴾ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ﴿۱۸﴾﴾ (النجم)

''اور ایک مرتبہ پھر اُس نے سِدرَۃ المنتہیٰ کے پاس اُس کو (جبرائیلؑ کو) اترتے دیکھا' جہاں پاس ہی جنت الماویٰ ہے۔ اُس وقت سِدرہ پر چھارہا تھا جو کچھ کہ چھارہا تھا۔ نگاہ نہ چندھیائی نہ حد سے متجاوز ہوئی۔ اور اس نے اپنے ربّ کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں''۔

یہ مشاہدات عالمِ غیب کے ہیں نہ کہ عالمِ شہادہ کے۔ یہ جنت اور دوزخ کے مشاہدات ہیں' یہ عالم ملکوت کے پردے اٹھائے جارہے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ نُرِیٓ اِبۡرٰهِيۡمَ مَلَكُوۡتَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ....﴾ (الانعام:۷۵)
''اور اسی طرح ہم ابراہیمؑ کو آسمانوں اور زمین کے ملکوت کا مشاہدہ کراتے رہے......''

تو معلوم ہوا کہ عام انسانوں کے لیے جو چیزیں غیب کے درجے میں ہوتی ہیں نبی کو اُن میں سے کچھ دیا جاتا ہے تب ہی وہ نبی بنتا ہے' ورنہ نبوت کا سوال ہی نہیں۔ اس کو قرآن مجید نے واضح کر دیا ہے۔ سورۃ الجن میں فرمایا گیا:

﴿عٰلِمُ الۡغَيۡبِ فَلَا يُظۡهِرُ عَلٰى غَيۡبِهٖۤ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارۡتَضٰى مِنۡ رَّسُوۡلٍ......﴾ (الجن:۲۶'۲۷)
''اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے' وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا' مگر اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہے......''

البتہ ماسویٰ اللہ کے لیے کُل غیب کے احاطے کا اگر تصور بھی ہو گیا تب تو کفر بھی ہو گیا اور شرک بھی ہو گیا۔ کُل غیب تو دُور کی بات ہے' اگر کُل حاضر کا تصور بھی ذہن میں آ گیا تو یہ بھی کفر اور شرک ہے۔

جس طرح ''شرک فی الذات'' کے ضمن میں قرآن مجید کا اہم ترین مقام سورۃ الاخلاص ہے' اسی طرح ''شرک فی الصفات'' یا بالفاظِ دیگر ''توحید فی الصفات'' کے ذیل میں قرآن مجید کا عظیم ترین مقام آیت الکرسی ہے۔ اس میں فرمایا گیا: ﴿وَلَا يُحِيۡطُوۡنَ بِشَیۡءٍ مِّنۡ عِلۡمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ﴾ ''اور وہ احاطہ نہیں کر سکتے اللہ کے علم میں سے کسی بھی شے کا' سوائے اس کے جو اللہ چاہے''۔ علمِ حاضر بھی اللہ ہی کا عطا کردہ ہے' ہمارا ذاتی نہیں ہے۔ آنکھ دیکھ رہی ہے تو اسے اللہ دکھا رہا ہے تو دیکھ رہی ہے' ورنہ آنکھ کے بس کا روگ نہیں ہے کہ دیکھ سکے۔ کان بھی سن رہے ہیں تو اللہ کے سنوانے سے سن رہے ہیں' ورنہ کانوں کا ذاتی وصف نہیں ہے کہ وہ سن سکیں۔ مخلوق کے ذاتی وصف اور صفت کا تو ہم نے انکار کر دیا۔ اس کا تو سوال ہی نہیں۔ ذاتی وصف اور ذاتی صفت تو ہے ہی صرف اللہ کے لیے۔ لہٰذا علمِ حاضر کے جو ذرائع ہیں وہ بھی جان لیجیے کہ ہمارے ذاتی نہیں' عطائی ہیں اور اِن کا بھی اللہ تعالیٰ نے دائرہ مقرر کر دیا ہے۔ آنکھ کی جو حد

7

ہے اتنا ہی دیکھے گی اس سے آگے نہیں۔ البتہ خوردبین لگا کر کچھ مزید دیکھ لے گی، لیکن پھر خوردبین کی بھی ایک حد ہے جس سے تجاوز ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا علمِ حاضر ہو یا علمِ غیب، اگر ماسویٰ اللہ کے لیے کُل کا احاطہ کریں گے تو شرک ہو جائے گا، ورنہ نہیں۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ ہم انبیاء کے علم کو ناپیں اور تولیں تو اس سے بڑا پاگل پن اور اس سے بڑی حماقت کوئی نہیں۔ اس لیے کہ وہ تو نوعیت کے اعتبار سے بھی ہمارے علم سے مختلف ہے۔ اسے ہم کیسے ناپیں گے! ہمارا علم تو علم بالحواس اور علم بالعقل ہے، جبکہ وہ علم، علم بالوحی ہے۔ لہٰذا جب حصولِ علم کے ذرائع اور مآخذ ہی مختلف ہوں اور ہم اپنے علم سے اُس علم کو ناپنے لگ جائیں تو اس سے بڑی حماقت اور اس سے بڑا ظلم کوئی نہیں ہے۔ ظلم کی تعریف ہے: ''وَضۡعُ الشَّیۡءِ فِیۡ غَیۡرِ مَحَلِّہٖ'' کہ کسی شے کو اُس کے اصل مقام سے ہٹا کر کہیں اور رکھ دینا۔ اسے منطق میں ''قیاس مع الفارق'' کہتے ہیں کہ جو چیزیں بنیادی طور پر اور تقسیم کے اعتبار سے ہی مختلف ہوں آپ ان کو ایک دوسرے پر قیاس کریں اور ان کو ایک دوسرے کے پیمانوں سے ناپ رہے ہوں۔ اور یہی ہے اصل مغالطہ۔ اللہ تعالیٰ نے جتنا علم چاہا محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو دے دیا۔ ہم کون ہیں کہ ناپیں محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے علم کو! جو یہ کہے گا کہ حضرت محمد ﷺ کا علم لامتناہی ہے، اور اللہ ہی کے علم کی طرح کامل اور کُل ہے وہ مشرک ہے۔ لیکن جو اِس کو اپنے تئیں ناپ تول کر بتائے گا کہ آپ ﷺ کا علم اتنا ہے تو وہ خدائی کا دعویٰ کر رہا ہے۔ اگر کوئی محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے علم کا حدود اربعہ خود معین کرنے بیٹھ گیا ہے تو یہ بھی کم درجے کی گمراہی نہیں ہے۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ آپ ﷺ کے پاس جو علم بھی تھا اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ تھا۔ انہیں جتنا دکھایا اللہ تعالیٰ نے دکھایا، جو بتایا اللہ تعالیٰ نے بتایا۔ آپ ﷺ نے کوئی غیب کی خبر دی تو اپنی ذات سے نہیں دی بلکہ اللہ کی بتائی ہوئی دی۔ جو لوگ انبیاء کے لیے علمِ غیب کی نفی کرتے ہیں وہ غیب کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ وہ علم جو خود حاصل ہو وہ غیب ہے۔ جبکہ خود تو یہاں پر چھٹانک بھر علم بھی حاصل ہونے کا امکان نہیں ہے۔ علم تو چاہے حاضر کا ہو چاہے غیب کا ہو وہ سب اللہ ہی کا دیا ہوا ہے۔ تو اصل میں یہ علم غیب

کی تعریف ہی کا سارا فساد ہے کہ تم نے غلط تعریف کی ہے جس کی بنا پر غیب کی نفی کر رہے ہو۔ نہ تو یہ کسی حدیث نبویؐ سے منقول ہے اور نہ ہی قرآن مجید کی کسی آیت سے منقول ہے۔قرآن کے الفاظ تو یہ ہیں:

﴿عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ......﴾ (الجن:۲۶'۲۷)

''وہ عالم الغیب ہے' پس وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا۔مگر جس کو پسند کر لے اپنے رسولوں میں سے......''

چنانچہ یہ غیب کے پردے اللہ تعالیٰ اٹھاتا ہے صرف انبیاء ورُسل کے لیے۔ البتہ کتنے اٹھاتا ہے' کتنی اس کی مشیت ہے' کس کو کتنا دکھاتا ہے' یہ وہ جانے اور اس کا رسول جانے جس نے دیکھا۔

قرآن مجید میں سورۃ النجم میں شب معراج کا ذکر ہوا ہے کہ وہاں کیا دیکھا محمدﷺ نے' تو اس میں ایک بہت اہم نکتہ پوشیدہ ہے جس کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں۔ اب ذرا غور کیجیے کہ میں اور آپ کیا سمجھ سکیں گے کہ وہاں محمدﷺ نے کیا دیکھا! اگر یہ بیان بھی کر دیا جائے تو ہمارے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آ سکتا کہ وہاں محمدﷺ نے کیا دیکھا۔ لہٰذا قرآن مجید نے صرف یہ کہا: ﴿لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْکُبْرٰی ﴿۱۸﴾﴾ ''انہوں نے دیکھا اپنے ربّ کی بڑی عظیم آیات کو''۔ سِدرَۃ المنتہٰی پر کیا تھا' اگر قرآن اسے بیان بھی کرے تو ہماری سمجھ میں کیا آئے گا! لہٰذا صرف فرمایا گیا: ﴿اِذْ یَغْشَی السِّدْرَۃَ مَا یَغْشٰی ﴿۱۶﴾﴾ ''جب کہ ڈھانپے ہوئے تھا اُس بیری کے درخت (سِدرہ) کو جو ڈھانپے ہوئے تھا''۔ تم کیا سمجھو گے' لہٰذا تمہیں کیا بتائیں کہ کیا ڈھانپے ہوئے تھا! بس تم اسی پر قناعت کرو کہ ''دیکھا (ہمارے بندے محمدﷺ نے) اپنے ربّ کی بڑی عظیم آیات کو''۔ اس سے آگے تمہارے حاشیۂ خیال میں آنے والی بات نہیں۔ یہ ہے معاملہ ہمارے علم اور ہماری حدود کا اور ہم اس کو لے کر ناپنے چلیں انبیاء کرام علیہم السلام کے علم کو' اور اس سے بھی آگے بڑھ کر سید الانبیاء' سید المرسلین حضرت محمدﷺ کے علم کو' تو یہ

ہماری بنیادی غلطی اور بنیادی قصور ہے۔ ہاں اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ نبی اکرمﷺ عالم الکُل ہیں' عالمُ ما کان وما یکون ہیں تو یہ عقیدے کی خرابی اور شرک ہے۔

اب ذرا ''مَا کَانَ وَمَا یَکُوْنُ'' کو بھی سمجھ لیجیے کہ کہنے والا اگر اس نیت سے کہہ رہا ہے کہ آپؐ کا علم ماضی پر بھی مشتمل ہے اور مستقبل پر بھی تو وہ غلط تو نہیں! اس لیے کہ ماضی کی بھی بہت سی خبریں نبی اکرمﷺ کو دی گئیں اور مستقبل کی بھی بہت سی خبریں آپﷺ کو دی گئیں۔ جب تک کہنے والا اس احاطے کے ساتھ نہ کہے کہ کُل ماضی اور کُل مستقبل کا علم آپؐ کے پاس ہے' تب تک اس میں کوئی حرج اور کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ یہ صرف دو کیٹیگریز کے اعتبار سے ہے۔ نبی اکرمﷺ قرآن مجید کے بارے میں یہ بیان کرتے ہیں کہ ((فِیْہِ نَبَأُ مَا کَانَ قَبْلَکُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَکُمْ......))(۱) ''اس میں جو کچھ تم سے پہلے ہوا ہے اس کی خبریں بھی ہیں اور جو کچھ تمہارے بعد ہونے والا ہے اس کی خبریں بھی ہیں''۔تو قرآن میں اگر ماضی کی خبریں بھی ہیں اور مستقبل کے حالات کے بھی اشارے موجود ہیں تو آپﷺ کیا قرآن کا علم بھی نہیں رکھتے کہ انہیں معلوم نہ ہو کہ ماضی میں کیا ہوا اور مستقبل میں کیا ہوگا؟ سارے فساد کی جڑ ہے تو وہ ایک لفظ ''کُل'' ہے۔ ''کُل'' اگر ماسویٰ اللہ کے لیے آ گیا تو یہ کفر بھی ہے اور شرک بھی ہے۔ ''کُل'' کی شان تو صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کی ہے۔ وہ ﴿بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ﴾ ہے . ﴿عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ ہے۔ یہ ''کُل'' کا لفظ اگر آپ کسی اور کے لیے لے آئے تو وہ گویا مطلق (absolute) ہو گیا جو کہ کفر و شرک ہے' حالانکہ absolute ذات صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کی ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہ صرف ایک لفظی نزاع اور اصطلاح کا جھگڑا ہے' تعریف (definition) کا ٹکراؤ ہے' ورنہ اس میں کوئی بنیادی اختلافی مسئلہ موجود نہیں ہے۔

خالق اور مخلوق کے ارادہ واختیار میں فرق وتفاوت

ذرا اور آگے چلیے! ارادہ ہم بھی کرتے ہیں اور ارادہ اللہ کا بھی ہے۔ لیکن وہ

(۱) سنن الترمذی' کتاب فضائل القرآن عن رسول اللهﷺ' باب ما جاء فی فضل القرآن۔

﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ﴾ ہے کہ جو ارادہ کرے اسے کر گزرنے والا ہے' جبکہ کسی اور کی یہ شان نہیں۔ سب کے ارادے اللہ کے ارادے کے تابع ہیں۔ اللہ کا ارادہ مطلق ہے' کسی کے تابع نہیں' اسے کہیں سے sanction اور منظوری نہیں لینی۔ ایسی بات نہیں کہ صدرِ امریکہ کوئی بل پاس کرانا چاہتا ہو لیکن پارلیمنٹ منظوری نہ دے اور اس کی جان مخمصے میں پھنس جائے۔ جیسے وقت کا فرعون جو خدائی کا مدعی تھا' اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کی قرارداد (resolution) اپنے دربار میں پیش کی' لیکن درباری نہیں مانے تو فرعون کے ہاتھ بندھ گئے۔ یہ مطلق شان اللہ کی ہے کہ وہ جو ارادہ کر لے کر گزرنے والا ہے۔ مشیتِ مطلق صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ فرمایا گیا ہے: ﴿يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ﴾ ''وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے''۔ ﴿يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ﴾ ''وہ جو چاہتا ہے تخلیق کرتا ہے''۔ ﴿تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ﴾ ''تو جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے''۔ اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ سے مخاطب ہو کر فرمایا: ﴿اِنَّکَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِیْ مَنْ يَّشَآءُ ج﴾ (القصص:٥٦) ''یقیناً (اے نبیؐ!) آپ ہدایت نہیں دے سکتے جس کو چاہیں' لیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے''۔ اُس کا اختیار مطلق ہے۔ اس کا ہاتھ کوئی نہیں روک سکتا۔ وہ چاہتا تو آنِ واحد میں ابوجہل کو ہدایت دے دیتا۔ ﴿يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ط﴾ (المائدة:١٨)

''وہ جس کو چاہتا ہے عذاب دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بخش دیتا ہے''۔ اگر وہ ابوجہل کو بخشنا چاہے تو اسے معاذ اللہ کون روکے گا! اور اگر وہ کسی بڑے سے بڑے نیک آدمی کو جہنم میں جھونکنا چاہے تو اس کا اختیار مطلق ہے' اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ ہمارے اور اہل تشیع کے مابین عقائد میں ایک بڑا بنیادی اختلاف یہ ہے کہ ہم اللہ پر عدل واجب نہیں سمجھتے' جبکہ ان کے نزدیک (نعوذ باللہ) اللہ پر عدل واجب ہے۔ ان کے نزدیک مجرم کو سزا دینا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے اور بے گناہ کو سزا نہ دینا اس پر واجب ہے' جبکہ ہمارے نزدیک ایسا نہیں ہے۔ وہ مالک الملک ہے' مختارِ مطلق ہے' مشیتِ مطلقہ کا حامل

ہے‘ وہ بڑے سے بڑے نیکو کار کو بھی جہنم میں جھونکنے میں بااختیار ہے۔ البتہ یہ ہم جانتے ہیں کہ وہ نہیں جھونکے گا۔ امر واقع (De facto position) کوئی اور ہے‘ لیکن اس پر کوئی چیز واجب نہیں۔ اس لیے کہ جب کسی پر کوئی چیز واجب ہوگئی تو وہ مطلق شان تو نہ رہی! ہمارے نزدیک اللہ کی شان ہے ہی مطلق۔ اگر ہم اللہ پر عدل کو واجب مانیں تو وہ تو گویا ایک قانون کا پابند ہو گیا۔ حالانکہ اس کی شان تو یہ ہے کہ اس نے جو قانون خود بنائے اس کا بھی پابند نہیں‘ جب چاہے انہیں توڑ دے۔ اس نے آگ میں جلانے کا وصف رکھا ہے لیکن جب چاہے اسے سلب کر لے‘ پانی میں سطح برقرار رکھنے کا وصف رکھا ہے لیکن جب چاہے اسے سلب کر لے۔ وہ اپنے بنائے ہوئے قوانین جب چاہے توڑے‘ وہ اپنی مِلک میں جس طرح چاہے تصرف کرے‘ اس کا اختیار مطلق ہے۔ جبکہ ہمارے اختیار اور ہماری مشیت کی کیا حیثیت ہے؟ فرمایا گیا: ﴿وَمَا تَشَآءُ وْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ (الدھر: ۳۰) اس کے دو بڑے پیارے ترجمے کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ: ’’اور تمہارے چاہے کچھ نہیں ہو گا جب تک اللہ نہ چاہے‘‘۔ لیکن یہ تو ہے نتیجہ کے اعتبار سے‘ یہ لفظی ترجمہ نہیں ہے بلکہ محتاط ترجمانی ہے۔ دوسرا ترجمہ ہے: ’’اور تم چاہ بھی نہیں سکتے جب تک کہ اللہ نہ چاہے‘‘۔ تمہاری چاہت ہی اس کی مشیت کے تابع ہے۔ یہ ہے اصل میں اللہ تعالیٰ کی مطلق مشیت‘ کہ تمہاری مشیت بھی اس کی مشیت کے تابع ہے۔ تم چاہ ہی نہیں سکتے جب تک کہ وہ نہ چاہے۔ یہ ہے اصل میں توحید کا وہ مقام کہ جہاں فنا ہو جاتا ہے انسان کا ارادہ اللہ کے ارادے میں کہ پروردگار! جو تو چاہے بس وہی ہے‘ میں کیا چیز ہوں اور میری مشیت اور ارادے کی کیا حیثیت ہے! اس میں چوٹی کی بات یہ ہے کہ سید المرسلین‘ محبوب ربّ العالمین حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی مشیت کے حوالے سے اگر دھوکہ ہو سکتا تھا تو اللہ تعالیٰ نے پیش بندی کے طور پر فرما دیا:

﴿اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰـکِنَّ اللّٰهَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ﴾ (القصص: ۵۶)

’’یقیناً (اے نبیؐ!) آپ نہیں ہدایت دے سکتے جسے بھی آپ چاہیں لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے‘‘۔

اب اس تنبیہہ اور راہنمائی کے بعد کہاں شرک کا امکان باقی رہ سکتا ہے! قرآن مجید نے تو ایسے سب راستے مسدود کر دیے ہیں جن سے شرک در آ سکتا تھا۔ اور نبی اکرم ﷺ کے ساتھ یہ اندازِ تخاطب ہے ہی اس لیے کہ کہیں مغالطے کا شائبہ بھی پیدا نہ ہو جائے' اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ الحمدللہ یہ اُمت بحیثیت مجموعی شرک سے بچی ہوئی ہے۔

خدا اور انسان کی حیات کا تقابل

اب آیئے حیات کی طرف۔ ہم بھی زندہ ہیں اور اللہ تعالیٰ بھی زندہ ہے' لیکن ہماری زندگی اوّل تو یہ کہ اپنی نہیں بلکہ عطائی ہے۔ع ''لائی حیات آئے' قضا لے چلی چلے''۔ دوسرے یہ کہ اس حیات کا دار و مدار اسباب پر ہے۔ کھائیں گے تو زندہ رہیں گے ورنہ مر جائیں گے' آکسیجن حاصل نہ رہے تو مر جائیں گے۔ اگر پندرہ بیس دن مسلسل جاگیں تو موت واقع ہو جائے گی۔ معلوم ہوا کہ یہ حیات بڑی ہی کمزور اور بے چاری ہے۔ یہ بڑی ہی مجبور زندگی ہے جو دوسروں کے سہارے پر قائم ہے۔ اس کے ساتھ ضعف اور احتیاج ہے' آرام اور نیند کی ضرورت ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کی حیات کیا ہے؟ آیت الکرسی میں ہے: ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ﴾ (البقرۃ:۲۵۵) کہ اس کی زندگی تو وہ زندگی ہے جس میں نہ اونگھ ہے اور نہ نیند ہے۔ اس کی قوتوں میں کوئی اضمحلال پیدا نہیں ہوتا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ۖ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ﴿۳۸﴾﴾ (قٓ)

''اور ہم نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے مابین ہے' چھ دنوں میں پیدا کیے اور ہم پر کوئی تکان طاری نہیں ہوئی''۔

یعنی خالق کائنات کی زندگی کو اپنی زندگی کے مظاہر پر قیاس نہ کر بیٹھنا۔ اُس کی زندگی اسباب اور سہاروں کے بل پر قائم نہیں' بلکہ قائم بالذات ہے' عطائی نہیں بلکہ ذاتی ہے۔ اب ذرا سوچیے کہ ہماری زندگی کو اُس کی زندگی کے مقابلے میں زندگی کہا جا سکتا ہے؟ یہ تو صرف صورتِ حیات ہے' حیات نہیں ہے۔ حیات تو صرف اللہ کے لیے ہے۔

اسی طرح ہمارے پاس صرف صورتِ علم ہے' علم نہیں ہے۔ العلم تو صرف اللہ کے لیے ہے۔ ہمارے اندر تو صرف ارادے کی ایک صورت ہے' حقیقتاً اور مطلقاً ارادہ تو صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ ہمارے اندر مشیت کی صرف ایک جھلک سی ہے' جبکہ اصل مشیت تو اللہ کی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالیے کہ مخلوقات کی جملہ صفات کو جب صفاتِ خالق کے مقابلے میں رکھا جائے گا تو کہا جائے گا کہ یہ معدوم کے درجے میں ہیں' ان کی حقیقت کچھ نہیں ہے۔ ہمارے پاس کچھ علم ہے' لیکن اللہ کے علم کے مقابلے میں نہیں ہے۔ ہمارے اندر حیات ہے' لیکن حیاتِ خداوندی کے مقابلے میں نہیں ہے۔ اللہ کے مقابلے میں ہمیں کوئی قدرت' علم' مشیت حاصل نہیں ہے۔

میں اس اہم بحث کے لیے نبی اکرم ﷺ کے قولِ مبارک سے سند پیش کرتا ہوں۔ نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دعائے استخارہ سکھائی۔ اور اس دعا کی عظمت کا یہ عالم ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ہمیں یہ دعا اس طرح تلقین فرمائی جیسے قرآن مجید کی کوئی سورۃ ہو۔ دعائے استخارہ کے الفاظ ہیں: ((**اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْتَخِیْرُکَ بِعِلْمِکَ وَاسْتَقْدِرُکَ بِقُدْرَتِکَ وَاَسْأَلُکَ مِنْ فَضْلِکَ الْعَظِیْمِ**(1)......)) ''اے اللہ! میں تیرے علم سے خیر کی بھیک مانگتا ہوں' اور تیری قدرت سے کچھ قدرت کی بھیک مانگتا ہوں اور میں تیرے فضل عظیم سے کچھ سوال کر رہا ہوں''۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے الفاظ سورۃ القصص میں آئے ہیں : ﴿**رَبِّ اِنِّیْ لِمَا اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ**﴿۲۴﴾﴾ ''اے میرے ربّ! تو جو بھی میری جھولی میں ڈال دے میں اس کا محتاج ہوں''۔ مقامِ عبدیت تو یہی ہے کہ ﴿**اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ**﴾ (فاطر:۱۵) کہ تم ہر معاملے میں اللہ کے محتاج ہو۔ دعائے استخارہ کے مذکورہ بالا تین جملے مقامِ عبدیت کی وضاحت کے لیے بہت عظیم ہیں۔ اگلے دو جملے ہیں: ((**فَاِنَّکَ تَقْدِرُ وَلَا اَقْدِرُ وَتَعْلَمُ وَلَا اَعْلَمُ**......)) ''پس تجھے ہی قدرت حاصل ہے' مجھے کوئی قدرت نہیں' اور تو جانتا ہے مجھے کوئی علم حاصل نہیں۔'' اب اگر نبی اکرم ﷺ کے اِن الفاظِ مبارکہ کو اللہ تعالیٰ سے

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الجمعة' باب ما جاء فی التطوع مثنی مثنی۔

تقابل میں نہ رکھا جائے تو یہ نعوذ باللہ جھوٹ ہو جائے گا کہ ''مجھے کوئی قدرت اورعلم حاصل نہیں''، جبکہ علم تو ہمیں بھی کچھ نہ کچھ حاصل ہے اور نبی اکرم ﷺ کا تو کہنا ہی کیا! اصل میں یہاں تقابل ہے کہ اے پروردگار! تیرے علم کے مقابلے میں میرا علم صفر ہے۔ تیری قدرت کے مقابلے میں میری قدرت صفر ہے۔ تو جب صفاتِ مخلوق کا صفاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ تقابل ہوگا تو مخلوق کی صفات معدوم کے درجے میں شمار ہوں گی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جو واقعہ سورۃ الکہف میں نقل ہوا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ جاؤ ہمارے ایک بندے کے پاس جسے ہم نے علمِ لدُنی عطا فرمایا ہے، تو قرآن مجید میں تو اگرچہ یہ تفصیل موجود نہیں ہے لیکن روایات میں آتا ہے کہ حضرت خضرؑ نے (اگرچہ ان کا نام قرآن میں نہیں ہے) حضرت موسیٰؑ سے فرمایا کہ اے موسیٰ! یہ جو کشتی کے کنارے پر آ کر چڑیا بیٹھ گئی ہے اور اس نے سمندر میں چونچ ڈال کر پانی پیا ہے تو اس پانی کو کوئی نسبت ہے اس سمندر کے پانی سے؟ تو جان لو کہ کُل مخلوقات کے علم کو اللہ کے علم کے مقابلے میں یہ نسبت بھی حاصل نہیں۔

وجود باری تعالیٰ اور نظریۂ وحدت الوجود

اب ذرا نظریہ ''وحدت الوجود'' کی بحث کی طرف آئیے کہ صرف اللہ کا وجود مطلق ہے، قدیم ہے اور دائم ہے، جبکہ ماسویٰ کا وجود عطائی ہے، محدود ہے، حادث اور فانی ہے۔ گویا کہ وجود تو صرف اسی کا ہے، کسی اور کا کوئی وجود ہے ہی نہیں۔ یہ ماسویٰ سے وجود کی نفی ہے۔ یہ ''وحدت الوجود'' ہے اور درحقیقت یہ توحید فی الصفات کی بلند ترین منزل ہے۔ جو یہاں نہیں پہنچا وہ فکری سطح کے اعتبار سے توحید کی آخری منزل تک نہیں پہنچا۔ میں ذرا یہ وضاحت بھی کرتا چلوں کہ ہمارے وہ صوفیائے کرام جو اگرچہ ''وحدت الوجود'' کے قائل ہیں، لیکن انہوں نے ''وحدت الوجود'' کو ''ہمہ اوست'' (Pantheism) کے ساتھ خلط مبحث (confuse) کر دیا ہے، مثلاً ابن عربی، مولانا روم اور دیگر نامور صوفیاء، اِن کے بارے میں لوگ سوءِ ظن میں مبتلا ہیں۔ کچھ لوگ تو انہیں بے مہابا مشرک کہہ دیتے ہیں اور باقی لوگوں کی رائے بھی یہ ہے کہ وہ

گمراہی کی طرف چلے گئے۔ دیکھئے نظریہ ''ہمہ اوست'' کو تو میں بھی کفر اور شرک سمجھتا ہوں۔ اب ہمہ اوست اور وحدت الوجود کے فرق کو جان لیجیے! ''ہمہ اوست'' کو یوں سمجھئے کہ برف پگھل کر پانی بن گیا تو برف معدوم ہوگئی اور اب پانی ہی برف ہے۔ لہٰذا اِس اعتبار سے تو یہ کائنات حقیقت قرار پاتی ہے اور نعوذ باللہ خدا اس میں گم ہو جاتا ہے۔ جبکہ وحدت الوجود یہ ہے کہ حقیقتِ وجود صرف خدا کے لیے ہے اور ماسویٰ کا وجود ہی نہیں ہے۔ تو ان دونوں نظریات میں زمین و آسمان کا فرق واقع ہوگیا اور یہ ایک دوسرے کی ضد ہو گئے۔ اس لیے کہ ''ہمہ اوست'' میں مخلوق حقیقت ہے اور خالق اس میں گم ہے اور ''وحدت الوجود'' میں خالق حقیقت ہے اور مخلوق کا وجود گم ہے۔ لہٰذا جب ان دونوں نظریات کو خلط مبحث کیا گیا تو بہت سے لوگوں کو مغالطہ ہوگیا۔ جب یہ confusion زیادہ ہوا تو اس میں حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ نے اصلاح کی اور انہوں نے ''وحدت الوجود'' کے بجائے ''وحدت الشہود'' کا نظریہ پیش کیا۔

وحدت الشہود یہ ہے کہ حقیقی وجود صرف اللہ کا ہے اور کائنات کا وجود اعتباری ہے اور اُس کا محض عکس ہے۔ جیسے اصل وجود درخت کا ہوتا ہے' لیکن اس کا سایہ جو زمین پر پڑ رہا ہوتا ہے وہ نظر تو آ رہا ہوتا ہے لیکن اس کا وجود کوئی نہیں ہوتا۔ ایسے ہی یہ ساری کائنات اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے اظلال اور سائے ہیں اور ان کی کوئی ذاتی حقیقت نہیں ہے۔ جیسے کسی شاعر نے کہا: ؎

كلُّ ما فى الكون وهمٌ او خيال

او عكوسٌ فى المرايا او ظلال

کہ جو کچھ اس کائنات میں ہے وہ محض وہم ہے یا خیال ہے' یا جیسے شیشے میں کوئی عکس ہوتا ہے یا سایہ۔ آپ شیشے میں نظر تو آ رہے ہوتے ہیں لیکن وہاں ہوتے نہیں ہیں۔ انہوں نے اسے ایک اور مثال سے یوں واضح کیا کہ ایک لکڑی لے کر اس کے ایک سرے پر کپڑا باندھیں اور اس کے اوپر مٹی کا تیل ڈال کر آگ لگا دیں اور اسے ایک دائرے میں تیزی کے ساتھ حرکت دیں تو دیکھنے والوں کو یہ ایک آتشیں دائرہ نظر آتا ہے۔ لیکن

درحقیقت وہ آگ کا دائرہ نہیں ہوتا‘ بلکہ شعلے کی حرکت آتشیں دائرے کا روپ دھار لیتی ہے۔اب دیکھئے اس نظریے میں کائنات اور ماسویٰ کی نفی ہوگئی اور اثبات صرف اللہ کا ہوا۔ ”وحدت الوجود“ اور ”وحدت الشہود“ میں صرف تعبیر کا فرق ہے‘ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ نے لوگوں کو سمجھانے کے لیے یہ فرق کیا ہے۔ یہ محض سمجھانے کا ایک لطیف سا انداز ہے۔

اس کی ایک اور بہترین تمثیل اِس دَور میں مولانا مناظر احسن گیلانی نے یہ بیان کی کہ تم ذرا تصور کر کے اپنے ذہن میں تاج محل یا مینارِ پاکستان کا نقشہ لے آؤ۔ یہ گویا تمہاری محض ایک خیالی تخلیق ہے جو تمہارے ذہن میں ہے اور تمہارے ذہن سے باہر اِس کا کوئی وجود نہیں۔اس کے اوپر بھی تم ہو‘ اس کے نیچے بھی تم ہو‘ اس کے باہر بھی تم ہو اور اس کے اندر بھی تم ہو۔تو یہی نسبت خالق ومخلوق کے مابین ہے۔قرآن مجید اللہ تعالیٰ کے بارے میں فرماتا ہے: ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾ (الحدید:۳) ”وہی اوّل ہے‘ وہی آخر ہے‘ وہی ظاہر ہے اور وہی باطن ہے“۔اور یہ کائنات محض اس کے خیال کے مانند ہے۔ ہمارا خیال تو بڑا کمزور سا خیال ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا خیال بڑا ٹھوس اور پختہ خیال ہے۔ البتہ یہ جان لیجیے کہ جس طرح ہماری ذہنی تصویر کا انحصار اور قیام ہماری توجہ پر ہوتا ہے‘ جیسے ہی توجہ ہٹتی ہے تصویر بھی ذہن سے محو ہو جاتی ہے‘ اسی طرح اس کائنات کا قیام بھی اللہ تعالیٰ کی توجہ سے ہے۔اُس کی توجہ ہٹے تو یہ معدوم ہے۔اسی لیے کہا گیا کہ وہ الحیّ القیّوم ہے‘ از خود ہے اور اس کائنات کو تھامے ہوئے ہے۔جیسے تم اپنی توجہ کو مرتکز رکھو گے تو وہ ہیولیٰ تمہارے ذہن میں رہے گا‘ تم قیوم ہو اُس کے‘ ایسے ہی اللہ تعالیٰ پوری کائنات کا القیوم ہے‘ اسے تھامے ہوئے ہے۔

آیت الکرسی میں صفاتِ باری تعالیٰ کے بیان کے بعد الفاظ آئے ہیں: ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ اس لیے کہ مسئلۂ شفاعت کا تعلق بھی صفات والی بحث سے ہے۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات OO

پاکستان کا مستقبل

ہمارے طرزِ عمل کی روشنی میں

انجینئر نوید احمد

ہمارا دینی اور ملی فریضہ ہے کہ ہم اپنے گردوپیش کے حالات سے باخبر رہیں اور اصلاحِ حال کی کوشش کرتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک غفلت کی زندگی انسانی نہیں بلکہ حیوانی سطح کی زندگی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۔ۡ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۔ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۔ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾﴾ (الاعراف)

’’اور ہم نے بہت سے جن اور انسان جہنم کے لیے پیدا کیے ہیں‘ اُن کے دل ہیں لیکن اُن سے سمجھتے نہیں‘ اور اُن کی آنکھیں ہیں مگر اُن سے دیکھتے نہیں‘ اور اُن کے کان ہیں پر اُن سے سنتے نہیں‘ یہ لوگ (بالکل) چوپایوں کی طرح ہیں‘ بلکہ اُن سے بھی بھٹکے ہوئے‘ یہی وہ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔‘‘

اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو جانوروں سے تشبیہہ دی ہے جو غفلت کی زندگی بسر کر رہے ہوں۔ انسان کو اللہ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے اور اُس میں اپنی روح رکھی ہے۔ روح سوچتی بھی دل سے ہے‘ دیکھتی بھی دل سے ہے اور سنتی بھی دل سے ہے۔ روح کا سوچنا‘ دیکھنا اور سننا عبرت والا ہوتا ہے۔ اگر انسان عبرت حاصل نہیں کر رہا تو پھر وہ حیوانی سطح پر دیکھ اور سن رہا ہے۔ اللہ ہمیں اِس غفلت سے محفوظ فرمائے۔ شیطان کا یہ حربہ ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ ہم مسائل سے لاتعلق ہو کر کسی جزوی نیکی کے اندر ہی لگے رہیں اور مطمئن رہیں کہ ہاں ہم اپنی دینی ذمہ داری پوری کر رہے ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنی زندگی کی آخری نظموں میں

سے ایک نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' میں بیان کیا ہے کہ ابلیس کو دنیا میں اپنے مکروہ عزائم کے حوالے سے اصل خطرہ مسلمانوں سے ہے۔ اُس کو اندیشہ لاحق ہے کہ کہیں مسلمان پھر سے نہ جاگ جائیں۔ لہٰذا وہ ایک مسلمان کو غافل رکھنے کی تدبیر یہ بتاتا ہے کہ :

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اُسے
پختہ تر کردو مزاجِ خانقاہی میں اُسے

یہ نمازیں پڑھتا رہے' روزے رکھتا رہے' حج وعمرے کرتا رہے' اپنی اِن مذہبی سرگرمیوں میں مطمئن رہے اور گرد و پیش کے حالات کے تجزیہ اور اصلاح کے لیے سوچ بچار سے لاتعلق رہے۔ ابلیس کی تدبیر کو ناکام کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے حالات کو دیکھیں' تجزیہ کریں اور اِس کے بعد اِن حالات کی اصلاح کی کوشش کریں۔

پاکستان کی خصوصی اہمیت

اگرچہ وطنِ عزیز ہونے کے ناتے پاکستان کے مستقبل کے حوالے سے غور وفکر کرنا ہم پر لازم ہے' لیکن پاکستان کے بارے میں ہم پر یہ ذمہ داری اِس لیے بڑھ جاتی ہے کہ یہ وہ واحد ملک ہے جس کے قیام کی بنیاد ہی اسلام ہے۔ پاکستان کا مطالبہ کرنے والوں کی نہ زبان ایک تھی' نہ ثقافت' نہ نسل اور نہ رنگ ایک تھا۔ اُن کے درمیان واحد مشترکہ اساس صرف اور صرف اسلام کی تھی۔ ہم نے یہ ملک حاصل کیا تھا اسلام کے نام پر کہ ہم یہاں اسلام کا بول بالا کریں گے۔ البتہ یہ بات درست ہے کہ پاکستان کے قیام کے لیے مسلمانانِ برعظیم کے متحد ہونے کا ایک منفی سبب ہندو قوم کا تعصب بھی تھا۔ ہمیں خوف تھا کہ اگر متحدہ ہندوستان آزاد ہوا تو ہندو ہم سے اپنی سابقہ محکومی کا انتقام لے گا۔ ہماری اِس صورتِ حال سے مطابقت رکھنے والی کیسی واضح نقشہ کشی اِس آیت میں کی گئی ہے کہ :

﴿وَاذۡكُرُوۡۤا اِذۡ اَنۡتُمۡ قَلِيۡلٌ مُّسۡتَضۡعَفُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ تَخَافُوۡنَ اَنۡ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰٮكُمۡ وَاَيَّدَكُمۡ بِنَصۡرِهٖ وَرَزَقَكُمۡ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ۝۲۶﴾ (الانفال)

''اور یاد کرو جبکہ تم تعداد میں کم تھے' زمین میں کمزور کردیے گئے تھے' تم ڈرتے تھے کہ لوگ تمہیں دبوچ لیں گے' پس اللہ نے تمہیں ٹھکانہ دیا اور اپنی خاص نصرت سے تمہاری مدد کی اور تمہیں پاکیزہ رزق عطا کیا تاکہ تم اُس کا شکرادا کرو۔''

تاویلِ خاص کے اعتبار سے یہ آیت مدنی دَور میں اُن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے خطاب کے ذیل میں نازل ہوئی جو مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئے تھے' لیکن تاویلِ عام کے اعتبار سے اِس کا ہو بہو اطلاق مسلمانانِ برعظیم پر بھی ہو رہا ہے۔ ہمیں ہندو قوم سے ظلم و زیادتی کے خدشات تھے' لہٰذا ہم نے متحد ہو کر علیحدہ وطن کے حصول کے لیے جدوجہد کی اور اللہ تعالیٰ نے پاکستان کی صورت میں ٹھکانہ عطا فرما دیا۔ البتہ ہندو قوم کی دشمنی کا مقابلہ کرنے کے لیے ہم سب نے جو اتحاد کیا تھا' اُس حوالے سے بھی ہماری وحدت کی بنیاد اسلام ہی کے رشتہ پر اُستوار تھی۔ گویا اسلام کو پاکستان کی تشکیل میں فیصلہ کن عامل کی حیثیت حاصل تھی۔ اقبال کے یہ الفاظ پاکستان پر کس قدر صادق آتے ہیں کہ ع ''اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے!''

پاکستان کا مستقبل

جیسا کہ عرض کیا گیا پاکستان کے قیام کے دو اسباب تھے۔ مثبت سبب اسلام کے عادلانہ نظام کا غلبہ اور منفی سبب ہندو قوم کا مسلمانوں سے تعصب اور دشمنی۔ بدقسمتی سے پاکستان کے قیام کے بعد ہم نے نہ صرف اسلام کے حوالے سے کوئی پیش قدمی نہ کی بلکہ مختلف ذرائع ابلاغ اور کھیلوں کے ذریعے ہندو ثقافت کو فروغ دے کر ہندو دشمنی کے عنصر کو بھی ذہنوں سے ختم کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پاکستان جو ۱۹۴۷ء میں قائم ہوا تھا' ۱۹۷۱ء میں سقوطِ مشرقی پاکستان کے حادثہ سے دوچار ہو کر ٹوٹ گیا۔ ۱۹۷۱ء کی ذلت آمیز رسوائی سے بھی ہم نے کوئی سبق حاصل نہ کیا' لہٰذا باقی ماندہ پاکستان کا مستقبل بھی شدید خطرات سے دوچار ہے۔

ہمارا افسوسناک طرزِ عمل

مملکتِ خداداد پاکستان میں اسلام کی تعلیمات کے نفاذ کے حوالے سے ہماری کسی بھی حکومت کا طرزِ عمل اچھا نہیں رہا۔ اسلامی نظام کے قیام اور اسلامی قانون کے نفاذ کے لیے حاصل کیے جانے والے اِس ملک کا پہلا وزیرِ قانون بنایا گیا ایک ہندو جوگندر ناتھ منڈل کو۔ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے پہلے اجلاس کی صدارت بھی اِسی شخص سے کروائی گئی۔ قراردادِ مقاصد کو دستور میں شامل کرنے کے حوالے سے تاخیر کی گئی۔ پھر جب اِسے شامل کیا گیا' تو دستور کے عملی حصے میں رکھنے کے بجائے اُصولی حصہ میں رکھا گیا۔ پھر ہم نے

واشنگٹن کو اپنا قبلہ بنا لیا، ہم امریکہ کے گھڑے کی مچھلی بن گئے اور اُس کے عالمی مقاصد کی تکمیل کے لیے ایک آلۂ کار کی صورت میں خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۹۶۲ء میں ہم نے اُن عائلی قوانین کو بھی غیر اسلامی کر دیا جو انگریز کے دور میں بھی اسلامی شریعت کے عین مطابق تھے اور بھارت میں آج بھی مسلم پرسنل لاء کی حیثیت سے موجود ہیں۔ البتہ موجودہ حکومت کے دور میں ہمارا طرزِ عمل شرمناک حد تک افسوسناک رہا، جس کی وجہ سے پاکستان مستقبل میں خاتمہ کے قریب نظر آ رہا ہے (نعوذ باللہ من ذٰلک) ۱۲/ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو برسر اقتدار آنے کے بعد دو کتے بغل میں دبا کر تصویر شائع کرائی گئی اور اہلِ مغرب کو پیغام دیا گیا کہ میں تم ہی میں سے ہوں اور تمہارے کلچر کا وفادار ہوں۔ پھر اعلان کیا گیا کہ میرا آئیڈیل کمال اتاترک ہے۔ گویا ایک ایسی شخصیت کو آئیڈیل قرار دیا گیا جو مسلمانوں میں سیکولرزم کی اولین علامت ہے اور جس نے خلافت کے ادارے کی تنسیخ کا سیاہ کارنامہ انجام دیا، بقول اقبال : ؎

چاک کر دی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ، اوروں کی عیاری بھی دیکھ!

۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء تک اقتدار کو استحکام دینے کے لیے مکروہ عزائم کو نمایاں نہ کیا گیا۔ البتہ ۹/۱۱ کے واقعہ کے بعد بڑی دیدہ دلیری سے ناپاک منصوبوں پر عمل کا آغاز کیا گیا اور ایسے ایسے شرمناک اقدامات کیے گئے جن کی جرأت آج تک کوئی حکومت نہ کر سکی۔ اِس اجمال کی تفصیل کچھ اِس طرح ہے۔

قیامِ پاکستان کے مثبت سبب

اسلام کے حوالے سے شرمناک طرزِ عمل

۱) نظریۂ پاکستان سے U -Turn :

پاکستان کے قیام، استحکام اور اِس ملک میں بسنے والوں کے درمیان اخوت کی واحد اساس اسلام ہے۔ پاکستان دو قومی نظریہ کی بنیاد پر قائم ہوا۔ مصورِ پاکستان علامہ اقبال نے اِس حقیقت کی وضاحت اِس طرح کی : ؎

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

3

اُن کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری!

۱۱ستمبر۲۰۰۱ء کے بعد ہم نے دوقومی نظریہ کی نفی کرتے ہوئے نعرہ ایجاد کیا ''سب سے پہلے پاکستان''۔گویا اصل اہمیت جغرافیائی حدود کی ہے نہ کہ نظریہ کی۔ بھارت کے سابق وزیرِ اعظم اٹل بہاری واجپائی نے فوری طور پر یہ طعنہ دیا کہ حکومتِ پاکستان نے خود دوقومی نظریہ کی نفی کردی ہے' اِن کے نزدیک اہمیت اسلام یا مسلمانوں کی نہیں ہے بلکہ ایک خطۂ ارضی کی ہے۔کانگریس سے مسلم لیگ کا اختلاف ہی یہ تھا کہ کانگریس کے نزدیک اصل اہمیت ہندوستان کی تھی اور ہندوستان میں بسنے والے سب ایک ہی قوم تھے۔مسلم لیگ کا موقف تھا کہ اہمیت کسی زمین کے خطہ کی نہیں ہے' نظریہ کی ہے۔دنیا میں دو ہی قومیں ہیں۔ایک مسلمان قوم ہے جو نبی اکرمﷺ پر ایمان رکھتی ہے اور دوسری کافر قوم ہے جو آپﷺ کی نبوت پر ایمان نہیں رکھتی اور آپﷺ کے دعویٰ ٔنبوت کو جھوٹ قرار دیتی ہے۔لہٰذا مسلمان قوم' کافر قوم کے ساتھ کسی متحدہ وطنی قومیت کے پلیٹ فارم پر جمع نہیں ہوسکتی۔

۲) اسلام پر وطن کو ترجیح :

''سب سے پہلے پاکستان'' کا نعرہ لگا کر ہم نے اسلام پر وطن کو ترجیح دے دی۔اقبال کے نزدیک یہ وطن پرستی اِس دور کا سب سے بڑا شرک ہے :

اِس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اِس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبویؐ ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اِس بت کو ملا دے!

۳) جہاد کے تصور کی نفی :

۱۱ستمبر۲۰۰۱ء سے پہلے ہم ہاتھ اٹھا کر اور مکا دکھا کر کہتے تھے کہ دنیا جہادِ حریت اور

دہشت گردی میں فرق کرے۔ کشمیر میں جاری تحریک، جہادِ حریت ہے دہشت گردی نہیں ۔ مجاہدینِ کشمیر کو ہماری طرف سے ہر طرح کی حمایت حاصل تھی ۔ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد ہم نے یوٹرن لیا اور جہادِ حریت کو دہشت گردی کہنا شروع کر دیا۔ امریکی محکمۂ خارجہ کے ایک افسر رچرڈ آرمیٹج سے کہا کہ پاکستان میں اِس وقت کوئی بھی کیمپ نہیں جو دہشت گردوں کو تربیت دے رہا ہو اور اگر ہے تو کل تک ختم ہو جائے گا۔ جہادِ اصغر اور جہادِ اکبر کی اصطلاحات کا موازنہ کرتے ہوئے کہا کہ جہادِ اکبر اصل میں غربت اور ناخواندگی کے خلاف جہاد ہے اور اب صرف اِسی کی ضرورت ہے۔ یہ وہ تصور ہے جسے آنجہانی غلام احمد قادیانی نے پیش کیا تھا : ؎

اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال
دیں کے لیے حرام ہے اب جنگ اور قتال
اب آسماں سے نورِ خدا کا نزول ہے
اب جنگ اور جہاد کا فتویٰ فضول ہے
دشمن ہے وہ خدا کا جو کرتا ہے اب جہاد
منکر نبی کا ہے جو یہ رکھتا ہے اعتقاد

۴) اسلامی حکومت سے بے وفائی :

افغانستان میں طالبان کی حکومت دنیا بھر کی تمام اسلامی تحریکوں کے لیے روشنی کی کرن اور امیدوں کا مرکز تھی ۔ تمام مسلمان ملکوں کی ذمہ داری تھی کہ اِس حکومت کی پشت پناہی کرتے اور اُس سے ہر ممکن تعاون کرتے ۔ ہم نے اِس حکومت کو تسلیم کیا اور اِس کی ہر ممکن مدد بھی کر رہے تھے۔ لیکن صدر بش کے ایک فون پر ہم نے غیر مشروط طور پر طالبان کے خلاف امریکہ کا اتحادی بننا قبول کر لیا۔ ٹونی فرینکس نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ صدر بش نے صدر مشرف کے سامنے سات مطالبات رکھے ۔ خیال تھا کہ وہ تین مطالبات تسلیم کر لیں گے اور چار نہیں مانیں گے۔ لیکن حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ساتوں کے ساتوں مطالبات تسلیم کر لیے گئے ۔ اِس کے بعد ہم نے امریکہ کا بھرپور ساتھ دیا۔ امریکہ کے ساتھ intelligence information sharing کے نام پر طالبان کی مخبری کی اور امریکہ کو افغانستان میں کارروائیوں کے لیے لاجسٹک سپورٹ فراہم کی ۔ بظاہر کہا گیا کہ افغانستان پر حملہ امریکہ کے بحری بیڑوں سے ہو رہا ہے لیکن ٹونی فرینکس نے لکھا ہے کہ ستاون ہزار پروازیں پاک سرزمین سے اُڑ کر گئیں جنھوں نے افغانستان پر بمباری کی ۔ نہ صرف ہم نے طالبان کی

اسلامی حکومت کے خاتمہ میں حصہ لیا بلکہ افغانستان کے بےقصور مسلمانوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے۔

۵)اسرائیل کی ناجائز ریاست کوتسلیم کرنے کی طرف پیش رفت :

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسرائیل' فلسطینیوں کو اُن کی سرزمین سے بے دخل کر کے ناجائز طور پر قائم کیا گیا۔اسرائیل نے اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کی متعدد بار خلاف ورزیاں کیں' نہتے فلسطینیوں کا خون بہایا اور کئی اسلامی ملکوں کے خلاف جارحیت کی۔اسرائیل کے قیام کے حوالے سے مصور پاکستان علامہ اقبال نے کہا تھا:؎

ہے خاکِ فلسطیں پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہلِ عرب کا؟

یہودیوں کو دو ہزار سال قبل رومیوں نے ارضِ فلسطین سے نکال دیا تھا۔اب اگر دلیل یہ دی جارہی ہے کہ دو ہزار سال پہلے یہ زمین یہودیوں کی تھی لہٰذا اِس زمین پر اسرائیل قائم کرنا اُن کا حق ہے تو ہسپانیہ سے عربوں کو نکلے ہوئے تو صرف ۵۰۰ برس ہوئے ہیں اور مذکورہ دلیل کے مطابق سپین پر پھر مسلمانوں کا حق ہونا چاہیے۔بانی ٔ پاکستان محمد علی جناح نے اسرائیل کے حوالے سے کہا تھا کہ یہ ویسٹرن ورلڈ کی ناجائز ولادت ہے۔لیاقت علی خان کو دورہ ٔ امریکہ کے دوران جب یہودیوں کی طرف سے اسرائیل کوتسلیم کرنے کے عوض بہت سی مراعات کی پیشکش کی گئی تو اُنہوں نے جواب میں کہا تھا کہ Our souls are not for sale۔آج صورتِ حال یہ ہے کہ ہم اسرائیل کوتسلیم کرنے کے لیے بے چین ہیں۔یکم ستمبر ۲۰۰۵ء کو ہمارے وزیرِ خارجہ اپنے اسرائیلی ہم منصب کے ساتھ ملاقات کر چکے ہیں۔ ہمارے غیر سرکاری وفود اسرائیل کے دورے کر رہے ہیں اور ہمارے صدر صاحب اُس شیرون کے لیے کلماتِ تحسین کہہ چکے ہیں جو انتہائی درندہ صفت انسان ہے۔اُس نے ۱۹۸۲ء میں صابرہ اور شتیلا کے کیمپوں میں نہتے فلسطینیوں کا قتلِ عام کرایا اور فلسطینی علاقوں پر بے رحمانہ کارروائیوں کے ذریعے کئی فلسطینیوں کو شہید کیا۔اللہ نے اُسے دنیا ہی میں ذلیل کر دیا۔اِس وقت جب کہ وہ ہسپتال میں زندگی اور موت کی کشمکش سے گزر رہا ہے' اسرائیل کے صدر نے اُسے ناپسندیدہ شخص قرار دے کر برطرف کر دیا ہے اور فیصلہ کیا ہے کہ اگر وہ صحت یاب ہو جائے تب بھی سیاست میں حصہ نہیں لے سکے گا۔

٦) اسلامی اقدار مٹانے کے لیے طویل المیعاد منصوبہ بندی کا اعلان :

ہمارے صدر صاحب کئی بار یہ بیان دے چکے ہیں کہ انتہا پسندی کا خاتمہ محض جنگی مہمات کے ذریعے نہیں ہوسکتا۔ مسلمان ممالک سے بنیاد پرستی' جہادی کلچر' مغرب دشمنی کی فضا اور اسلامی تہذیب کو فروغ دینے والے اداروں کا قلع قمع کرنے کے لیے طویل المیعاد منصوبوں پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہے۔ پاکستان میں اِن منصوبوں پر کام کا آغاز کر دیا گیا ہے۔ امریکہ کو چاہیے کہ وہ اِن منصوبوں کی تکمیل کے لیے مالی امداد فراہم کرے اور اندرونِ ملک فراڈ جمہوریت سے صرفِ نظر کر کے حکومت کے ہاتھ مضبوط کرے۔

٧) مجاہدین کے خلاف ظالمانہ کارروائی :

افغانستان کو روس کے ناجائز قبضے سے آزاد کرانے کے لیے اور وہاں ایک اسلامی حکومت کے قیام کے لیے دنیا بھر سے مجاہدین اِس خطہ میں آئے۔ اِن میں سے کئی مجاہدین کو ہم خود ہی ترغیب وتشویق دے کر یہاں لائے تھے۔ یہ مجاہدین ایسے نہ تھے کہ مفلوک الحال تھے اور کسی مفاد کی خاطر یہاں آ گئے تھے۔ یہ بڑے بڑے خاندانوں کے چشم و چراغ تھے اور اِن کے فراہم کردہ وسائل نے روس کو افغانستان سے نکالنے اور وہاں ایک اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اِس کے بعد یہ مجاہدین اگر واپس اپنے ملکوں میں جاتے تو وہاں کے حکمران' جو درحقیقت امریکہ کے وائسرائے ہیں' اِنہیں اپنے اقتدار کے لیے خطرہ محسوس کر کے مار ڈالتے۔ لہٰذا یہ افغانستان اور پاکستان کے بعض علاقوں میں آباد ہو گئے۔ ہماری موجودہ حکومت اِنہیں پکڑ پکڑ کر امریکہ کے حوالے کر رہی ہے۔ اپنوں سے بے وفائی اور غیروں سے وفاداری بہت برا وصف ہے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ سے کسی نے کتے کی ناپسندیدگی کی عقلی وجہ پوچھی تو اُنہوں نے جواب دیا کہ کتا اپنوں کا دشمن اور غیروں کا وفادار ہوتا ہے۔ جب ہم نے ابوفراج کو گرفتار کر کے امریکہ کے حوالے کیا تو واشنگٹن پوسٹ میں کارٹون شائع ہوا جس میں پاکستان کو ایک کتے کی صورت میں دکھایا گیا جو ابوفراج کو پکڑ کر امریکی سپاہی کے قدموں میں ڈال رہا ہے۔ گویا امریکہ کی غلامی کر کے بھی ہمیں عزت نہ ملی' دھوبی کا کتا' گھر کا نہ گھاٹ کا۔ اور : ؎

خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم
اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

صدر بش ہمیشہ صدر مشرف کی تحسین تو کرتے ہیں لیکن پاکستان کی تعریف میں ایک لفظ نہیں کہتے اور پاکستانیوں کو طنزیہ طور پر ''پاکی'' کہتے ہیں۔

۸) امریکہ کے شرمناک جرائم پر مجرمانہ خاموشی :

امریکہ نے عراق پر من گھڑت الزامات لگا کر حملہ کیا' کئی ہزار افراد کو ہلاک کیا اور کئی شہروں کو تباہ و برباد کر دیا۔ ابوغریب جیل میں نہتے قیدی مردوں اور عورتوں پر شرمناک مظالم ڈھائے اور ایذا رسانی کی تصاویر شائع کر کے اُنہیں رُسوا کیا۔ گوانتانا موبے میں بھی قیدیوں کے ساتھ سفاکی کا مظاہرہ کیا۔ قرآنِ حکیم کی کئی بار توہین کی۔ توہینِ رسالت کا ارتکاب کرنے والے مجرم ملک ڈنمارک کے وزیرِ اعظم کو اپنی مکمل حمایت کی یقین دہانی کرائی۔ ہم اِس وقت امریکہ کے فرنٹ لائن اتحادی ہیں۔ اگر ہمارا ضمیر زندہ ہوتا اور ہم میں کچھ بھی غیرت کا مادہ ہوتا تو ہماری ذمہ داری تھی کہ ہم امریکہ کے اِن جرائم کے خلاف آواز اٹھاتے اور اُن کے سفیر کو بلا کر احتجاج ریکارڈ کراتے۔ لیکن ہم نے اپنی مجرمانہ خاموشی کے ذریعے بدترین جرم کا ارتکاب کیا۔

۹) روشن خیالی کے نام پر اسلامی تصورات میں تحریف :

روشن خیالی اور اعتدال پسندی کے نام پر اسلام کا ایک خود ساختہ تصور ذرائع ابلاغ کے ذریعے عام کیا جا رہا ہے۔ پہلے مغرب اور اُس کے ایجنٹوں کی طرف سے اسلام کے بعض شعائر پر اعتراضات کیے جاتے تھے۔ اب اُن کا طریقۂ واردات بدل گیا ہے۔ اب وہ ایک ایسے خود ساختہ اسلام کا تصور عام کر رہے ہیں جو کسی بھی اعتبار سے مغرب اور اُن کے گمراہ کن نظریات کے لیے خطرہ نہ بنے۔ ایسا اسلام جو مغرب کے تصورات' فکر اور اقدار سے بالکل ہم آہنگ ہو۔ ذرائع ابلاغ کے ذریعے علماء اور ائمۂ مساجد کی توہین کی جا رہی ہے اور ایسے دانشوروں کو زیادہ اہمیت دی جا رہی ہے کہ جو روشن خیالی کے نام پر اسلام کا ایسا تصور پیش کر رہے ہیں جس میں پردے کے احکامات کی نفی ہے' سود کی حرمت کا ذکر ہی نہیں بلکہ اِس کے جواز کے لیے فتوے ہیں' موسیقی کے جواز کے لیے دلائل ہیں' جہاد کے تصور کی نفی ہے اور مذہب و سیاست کو جدا کیا جا رہا ہے۔ قرآنِ حکیم کی من چاہی تفسیر کی جا رہی ہے اور اِس حوالہ سے اُس رہنمائی کو نظر انداز کیا جا رہا ہے جو احادیثِ مبارکہ اور سنت رسول ﷺ سے حاصل ہوتی ہے۔ رواداری کے نام پر ایمان بالرسالت کی اہمیت کو ختم کیا جا رہا ہے۔ برعظیم میں

ایمان بالرسالت پر تیسری بار نظریاتی حملہ ہو رہا ہے۔سب سے پہلے اکبر کے دور میں فتنہ اُٹھایا گیا کہ دینِ محمدی ﷺ صرف ایک ہزار برس کے لیے تھا' اب دینِ الٰہی کی ضرورت ہے جس میں مذہب کی بنیاد پر انسانوں میں کوئی تفریق نہ ہوگی۔ ہندوستان میں بسنے والے مختلف مذاہب کے لوگ دینِ الٰہی قبول کر کے اکبر کے ہاتھ پر بیعت کر لیں۔اگر مذہبی تفریق رہی تو ہندوستان میں مغلوں کی حکومت عدم استحکام کا شکار ہو جائے گی۔اِس فتنہ کے خلاف اکبر اور جہانگیر کے ادوار میں پہاڑ کی طرح ڈٹ گئے شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی ؒ' جن کی تحسین اقبال نے اِس طرح کی:

حاضر ہوا میں شیخ مجدد کی لحد پر
وہ خاک کہ ہے زیرِ فلک مطلعِ انوار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

دوسری بار یہ فتنہ اُس وقت کھڑا ہوا جب گاندھی جی نے کانگریس کے پلیٹ فارم سے ایک متحدہ وطنی قومیت کا تصور پیش کیا۔اِس تصور کے مطابق ہندوستان میں بسنے والے تمام افراد ایک ہی قوم ہیں چاہے وہ ہندو ہوں' سکھ ہوں' عیسائی ہوں' پارسی ہوں یا مسلمان ہوں۔ اُس وقت اِس فتنہ کی سرکوبی کی سعادت حاصل ہوئی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور علامہ اقبال کو۔اب یہ فتنہ تیسری بار اُٹھا ہے۔لبرل ازم اور روشن خیالی کے نام پر قرآنِ حکیم کی تعلیمات اور اسلام پر عمل کا رشتہ سنتِ رسول ﷺ سے کاٹا جا رہا ہے۔

۱۰) مدارس کے خلاف آپریشن :

برعظیم میں دینِ اسلام کے صحیح فکر کی مدافعت وحفاظت کے حوالے سے مدارس کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اہلِ ہند کو شکست دے کر مغرب نے عسکری وسیاسی فتح حاصل کر لی۔اِس کے بعد فکری غلبہ کے حصول کے لیے اپنا نظامِ تعلیم رائج کرنے کا آغاز کیا۔فکرِ مغرب کی یلغار کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمارے ہاں دو عَلمی تحریکیں شروع ہوئیں۔ایک تھی ''تحریکِ علی گڑھ'' جس کا لائحہ عمل یہ تھا کہ جدید سائنسی ترقی کا ساتھ دینے کے لیے مغربی علوم سیکھے جائیں لیکن اپنے دینی عقائد وشعائر کو برقرار رکھا جائے۔ دوسری

تحریک تھی ''تحریکِ دیوبند'' جس کا نظریہ تھا کہ ہم مغربی یلغار کا مقابلہ نہیں کر سکتے' لہٰذا ہم مغربی علوم نہیں پڑھیں گے بلکہ اپنے دین و ایمان کو بچانے کے لیے صرف دینی علوم ہی سیکھیں گے۔ تحریکِ علی گڑھ کا یہ فائدہ تو ہوا کہ جدید علوم سیکھ کر ہم عصرِ حاضر کا ساتھ دینے کے قابل ہو گئے لیکن یہ تحریک فکری اعتبار سے مغرب کے گمراہ کن تصورات سے محفوظ نہ رہ سکی۔ الحاد اور مادہ پرستانہ طرزِ فکر جدید علوم کے ساتھ ذہنوں پر اثر انداز ہو گئے۔ سائنس کی مرعوبیت نے نگاہوں کا چکا چوند کر دیا۔ خالص مادہ پرستانہ نقطۂ نظر سے' سائنس کے دریافت کردہ نظریات کو حتمی سمجھتے ہوئے اور عقلی توجیہات کی روشنی میں تعلیماتِ قرآنی اور دینی عقائد کی نت نئ تعبیرات کی جانے لگیں۔ بقول اقبال ؒ :

ہم تو سمجھے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ!

اور بقول اکبرالہٰ آبادی ؒ :

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

ایسے میں تحریکِ دیوبند کے زیرِ اثر قائم ہونے والے مدارس ہی تھے جنہوں نے دین کے عقائد و شعائر کو اصل صورت میں برقرار رکھا اور اِن کی حفاظت کا حق ادا کر دیا۔ موجودہ حکومت اِن مدارس کے خلاف آپریشن کر رہی ہے' اِن میں رائج نصابِ تعلیم کو تبدیل کرنے کے لیے دباؤ ڈالا جا رہا ہے اور غیر ملکی طلبہ کو نکالنے کے لیے بڑے سخت قسم کے احکامات دیے جا رہے ہیں۔ ہمارے لیے ڈوب مرنے کا مقام یہ ہے کہ بھارت نے پیشکش کی ہے کہ پاکستان سے جن طلبہ کو نکالا جائے وہ بھارت آ جائیں۔ ہمارے ہاں مدارس میں دہشت گردی کی تعلیم نہیں دی جاتی۔ وہ ملک جو اسلام کے نام پر بنا تھا وہاں سے ہم اللہ کے اُن بندوں کو نکال رہے ہیں جو کسی ذاتی غرض سے نہیں' دنیا بنانے کے لیے نہیں' بلکہ دینی علم سیکھنے کے لیے آئے ہیں۔ حکومت مدارس کو دہشت گردی کے مراکز قرار دے رہی ہے' حالانکہ اِن مدارس سے فارغ التحصیل کوئی فرد بھی دہشت گردی کی کسی واردات میں ملوث نہیں پایا گیا۔ ۹/۱۱ اور ۷/۷ کے واقعات میں بھی مدارس کے طلبہ کے ملوث ہونے کا امکان ظاہر نہیں کیا گیا۔ اِس کے باوجود بھی دہشت گردی کے خلاف کارروائی کا ہدف مدارس کو بنایا جا رہا ہے۔

۱۱) آغا خان تعلیمی بورڈ کا قیام :

ملک کے تعلیمی نظام کو آغا خان تعلیمی بورڈ کے حوالے کیا جا رہا ہے۔ اِس بورڈ کی سرگرمیوں کے لیے امریکہ امداد دے رہا ہے۔ اِس بورڈ کے تحت پہلے ٹیسٹ میں طلبہ و طالبات کو ایسا questionare دیا گیا جس میں جنسی اعتبار سے انتہائی غیر مہذب سوالات پوچھے گئے۔ اِسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جنسی اعتبار سے قوم کو کس قدر بے حیا بنانے کے مشن پر کام کیا جا رہا ہے۔ ظاہری بات ہے کہ اگر کسی ادارے کو امریکہ فنڈز دے رہا ہے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُس ادارے کا مقصد کیا ہے؟ اِس تعلیمی بورڈ کے ذریعے سے طلبہ اور طالبات کو مغربی سوچ اور ثقافت کے رنگ میں رنگنا پیشِ نظر ہے۔

آغا خان تعلیمی بورڈ کے دائرۂ کار کو وسیع کرنے کے لیے سرکاری بورڈز کے تحت جاری نظامِ تعلیم کے خلاف ایسے اقدامات کیے جا رہے ہیں کہ نجی تعلیمی ادارے آغا خان تعلیمی بورڈ سے الحاق پر مجبور ہو جائیں۔ پہلے بڑا اچھا سلسلہ تھا کہ فروری اور مارچ کے مہینوں میں امتحانات ہوتے تھے۔ ۳۱ مارچ کو نتیجہ نکلتا تھا۔ اِس کے بعد دو مہینے اگلی کلاس کی پڑھائی ہوتی تھی۔ جون اور جولائی میں تعطیلات کے لیے ہوم ورک دیا جاتا تھا تاکہ طلبہ اور طالبات چھٹیوں کے دوران بالکل فارغ نہ بیٹھیں۔ پہلے حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ امتحانات مئی میں لیے جائیں گے، ۳۱ مئی کو نتیجہ سنا کر چھٹیاں دے دی جائیں گی۔ نہ طلبہ اگلی کلاس میں گئے، نہ اگلی کلاس کی کتابیں خریدیں اور نہ کوئی ہوم ورک دیا گیا۔ لہٰذا اب پورے دو مہینے طلبہ عیش کریں گے۔ اب فیصلہ یہ کیا گیا ہے کہ چھٹیاں بجائے دو کے تین مہینے کی ہوں گی۔ ۳۱ مئی تک امتحان مکمل ہوں گے اور نتیجہ کا اعلان ستمبر میں کیا جائے گا۔ گویا اب تین ماہ طلبہ بالکل فارغ رہیں گے۔ ایک فیصلہ یہ کیا گیا ہے کہ نویں، دسویں اور گیارہویں، بارہویں کے امتحانات ایک ساتھ لیے جائیں گے۔ طالب علم اکثر و بیشتر پڑھتے ہی امتحان کے خوف سے ہیں۔ اِسی لیے دنیا بھر کے نظام ہائے تعلیم میں امتحانات جلدی جلدی ہوتے ہیں۔ لیکن اب ایک طالبِ علم دو سال تک فارغ رہے گا اور پھر اُس پر ایک ساتھ کئی مضامین کے امتحان کا وزن پڑے گا جس سے اُس کی کارکردگی متأثر ہوگی۔

۱۲) نصابِ تعلیم میں تبدیلی :

ہمارے ہاں جدید تعلیمی اداروں کے نصاب میں دینی تعلیم کا عنصر پہلے ہی بہت کم تھا۔

اب امریکی خواہشات کی تکمیل کے لیے نصاب سے اِس عنصر کو بھی نکالا جا رہا ہے۔ اسلام کے تصورِ جہاد‘ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مجاہدانہ کردار کے تذکرے اور غزوات کے احوال کا بیان نکالا جا رہا ہے تا کہ طالب علموں میں کوئی تصورِ جہاد اور دین کی سربلندی کے لیے جہاد کا کوئی جذبہ سرے سے پیدا ہی نہ ہو۔ صحابیات رضی اللہ عنہن کے پاکیزہ کردار کا تذکرہ نکالا جا رہا ہے تا کہ بے پردگی اور بے حیائی کے خلاف ذہنوں میں احساسات جنم ہی نہ لیں۔ ختم نبوت سے متعلق مضامین ختم کیے جا رہے ہیں تا کہ اسلام دشمن قادیانی فتنہ کو پھلنے پھولنے کا موقع فراہم کیا جائے۔ برعظیم میں تحریک پاکستان کے دوران ہندو دشمنی کے واقعات مٹائے جا رہے ہیں تا کہ پاکستان کے قیام کے ایک جواز کا سدباب کیا جا سکے۔ مسلمانانِ برعظیم پر انگریز قابضین کے مظالم کے بیانات خارج کیے جا رہے ہیں تا کہ مغرب کے استعماری کردار کی پردہ پوشی کی جا سکے۔ فحاشی‘ جنسی بے راہ روی اور موسیقی کی طرف رغبت دلانے والے مضامین نصاب میں شامل کیے جا رہے ہیں تا کہ اِن خرافات میں مبتلا ہونے کے بعد کسی اعلیٰ مقصد کے لیے کام کرنے کا خیال بھی دلوں میں پیدا نہ ہو۔

سب سے بڑا ظلم جو حال ہی میں کیا گیا وہ یہ کہ نماز کا طریقہ نصاب سے خارج کیا جا رہا ہے۔ دلیل یہ دی جا رہی ہے کہ نماز کے طریقہ میں اختلاف ہے لہٰذا اِسے خارج کیا جا رہا ہے‘ حالانکہ طریقۂ نماز کا اختلاف ہمارے لیے بہت بڑی نعمت ہے۔ ایک صاحب نے جنگ اخبار میں بڑی پیاری بات لکھی کہ نماز کے طریقہ کے اختلاف کے ذریعے سے ہی ہم یہ بات اپنے لوگوں کو سمجھا سکتے ہیں کہ مسلمانوں میں جو مختلف مسالک ہیں‘ اُن کے درمیان اختلافات کی نوعیت بڑی سطحی ہے۔ سب کے نزدیک نماز میں قیام‘ رکوع‘ دو سجدے فرض ہیں‘ اِن کی ادائیگی کی ترتیب ایک ہی ہے اور فرض نماز کی رکعتوں میں کوئی اختلاف نہیں۔ اگر نماز کے حوالے سے اختلافی امور ہیں تو انتہائی فروعی نوعیت کے۔

برعظیم میں ہمارے اسلاف کی اردو زبان میں تحریروں اور شاعری کی صورت میں ایک بڑا علمی وفکری اثاثہ موجود ہے۔ اب پہلی کلاس سے انگریزی کی تعلیم کو لازمی کیا جا رہا ہے تا کہ اِس قیمتی اثاثہ سے نئی نسل کا تعلق بالکل ہی ختم کر دیا جائے۔ کسی بھی علم کے سیکھنے کے لیے سب سے زیادہ سہولت اپنی زبان میں ہوتی ہے۔ کئی ممالک میں جدید علوم کو مقامی زبان میں منتقل کر کے سکھایا جا رہا ہے۔ ہمارے ہاں پہلے تو طالبِ علم کو ایک دوسری زبان سیکھنے کی ذہنی مشقت برداشت کرنی پڑے گی اور پھر اُس زبان کو سیکھنے کے بعد اُس میں تحریر شدہ جدید علوم

سیکھنا پڑیں گے۔

گیارہویں کلاس کی انگریزی کی کتاب میں ایک ایسی نظم شامل کردی گئی ہے جس میں صدر بش کی بہادری اور جرأت کی مدح ہے۔ گویا ایک جھوٹے اور سفاک انسان کو آئیڈیل کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔

یہ ہیں وہ کارنامے جن پر امریکی خاتون وزیرِ خارجہ نے ہماری سابقہ وزیرۂ تعلیم کو Wonderful Minister کا خطاب دیا۔ پاکستان میں تھوڑے تھوڑے عرصے بعد امریکہ سے کرسٹینا روکا تشریف لاتی ہیں اور جائزہ لیتی ہیں کہ ہم نے جو guide lines دی تھیں اُن پر عمل درآمد کے حوالے سے کیا پیش رفت (progress) ہوئی؟

۱۳) عام انسان کو معاشی حیوان بنانے کا منصوبہ:

حکومت اپنی معاشی پالیسیوں کے ذریعے اِس ایجنڈے پر کام کر رہی ہے کہ ملک کے ایک عام شہری کو معاشی حیوان بنا دیا جائے۔ اُسے اپنی بنیادی ضروریات کی فراہمی کے لیے کولہو کے بیل کی طرح مشقت کرنی پڑے اور اُس کا بیشتر وقت اِسی مقصد کے لیے صرف ہو جائے تاکہ نہ وہ کوئی اعلیٰ سوچ سوچے اور نہ ہی باطل نظام کے خلاف کسی تحریک کا ساتھ دینے کے لیے اُس کے پاس وقت ہو۔ حکومت کے اکثر اقدامات ملک میں معاشی اعتبار سے موجود طبقاتی تقسیم کو پختہ کر رہے ہیں۔ غریب کو غریب سے غریب تر کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور اکثر ملکی وسائل کو مفاد یافتہ طبقات کی طرف منتقل کرنے کی منصوبہ بندی کی جا رہی ہے۔ پاکستان میں پہلے کبھی اتنی خودکشیاں نہیں ہوئیں جتنی اِس دورِ حکومت میں ہوئی ہیں۔ اِس حوالے سے شرمناک اقدامات حسبِ ذیل ہیں:

i) وفاقی شرعی عدالت کے bank interest کو ربا قرار دینے کے فیصلے کو انتہائی دھاندلی کے ذریعے سے کالعدم کر دیا گیا۔ اگر سود کی لعنت ختم ہوتی تو خود بخود سرمایہ گردش میں آتا اور سرمایہ داری کی جڑ کٹ جاتی۔

ii) پیٹرول، ڈیزل اور گیس کی قیمتوں میں مسلسل اضافہ کیا جا رہا ہے۔ عالمی مارکیٹ میں پیٹرول کی قیمتیں گرنے کے باوجود یہاں ہر پندرہ دن بعد پیٹرول کی قیمت بڑھا دی جاتی ہے، جس کی وجہ سے ہر چیز مہنگی ہو جاتی ہے۔ خاص طور پر کرائے اور سفری اخراجات بڑھائے جا رہے ہیں تاکہ لوگ اعلیٰ مقاصد کے لیے سفر کرنے کے بھی قابل نہ رہیں اور کسی ایک جگہ ظالمانہ نظام کے خلاف منصوبہ بندی کرنے اور اِس حوالے سے کسی تحریک

کومنظّم کرنے کے لیے جمع بھی نہ ہوسکیں۔

iii) اہم قومی اثاثہ جات کی نج کاری کی جارہی ہے اور اہم ادارے کوڑیوں کے مول من پسند سرمایہ داروں کو دیے جارہے جو ملازمین کی تعداد کم کررہے ہیں اور بقیہ ملازمین سے طویل اوقات تک کام لے رہے ہیں۔

iv) غیرترقیاتی اخراجات میں بے تحاشا اسراف کیا جارہا ہے۔VIPs کے استعمال کے لیے اعلیٰ قسم کی گاڑیاں اور طیارے خریدے جارہے ہیں۔ملک میں شدید زلزلہ آیا اور اپیل بھی کی گئی کہ اِن جہازوں کے سودوں کو منسوخ کرو اور یہ رقم زلزلہ کے متأثرین پر خرچ کرو، لیکن حکومت نے یہ اپیل ردّ کردی۔موجودہ دورِ حکومت میں پہلے اسمبلی کے ممبران کی تنخواہیں ۱۷ہزار روپے سے بڑھا کر ۳۸ہزار روپے کی گئیں اور اب اِن تنخواہوں میں مزید ۱۵فیصد کا اضافہ کیا گیا ہے۔اِس کے علاوہ ممبرانِ اسمبلی کی دیگر مراعات بھی بڑھادی گئی ہیں۔

v) تعلیم کو مہنگا کیا جارہا ہے تاکہ غریب طبقہ سرکاری تعلیمی اداروں میں تعلیم کے حصول کے لیے مجبور ہوجائے۔پھر سرکاری اداروں میں تعلیم کو اِس قدر ناقص کیا جارہا ہے کہ غریب طالب علموں میں اتنے جوہر پیدا ہی نہ ہوں کہ وہ کسی اعلیٰ منصب تک پہنچ سکیں اور سرکاری تعلیم سے صرف محکوم اور working طبقہ تیار ہوسکے۔مزید برآں بڑھتی ہوئی آبادی اور پھیلتی ہوئی بستیوں سے صرفِ نظر کرکے نئے سرکاری تعلیمی اداروں کے قیام کا سلسلہ بند کردیا گیا ہے۔امراء کے لیے الگ نظامِ تعلیم کو فروغ دیا جارہا ہے تاکہ وہی ملک کے کلیدی مناصب تک پہنچ سکیں۔

۱۴) بے حیائی اور فحاشی کی اشاعت :

بے حیائی اور فحاشی کی اشاعت جس تیزی کے ساتھ موجودہ دورِ حکومت میں ہوئی ہے' اِس کی نظیر ماضی کے کسی دورِ حکومت میں نہیں ملتی۔مقصد یہ ہے کہ قوم کو اسلام کی پاکیزہ تہذیب سے دور کرکے مادر پدر آزاد مغربی تہذیب سے ہم آہنگ کیا جائے۔کسی ملک میں بھی social engineering کے نام پر ایسے اقدامات نہیں کیے گئے۔جو ہماری حکومت نے کیے ہیں مثلاً :

i) مختلف ٹی وی چینلز پر حیا سوز مناظر دکھائے جارہے ہیں۔سائن بورڈز جتنے بے ہودہ اِس دور میں آویزاں کیے گئے ہیں پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔یوٹیلٹی بلز پر بے ہودہ تصویریں

گھروں پر آ رہی ہیں' یہاں تک کہ بچوں کی پینسلز' کا پیز اور بیگز پر بیہودہ تصویریں چھاپی جا رہی ہیں۔ موسیقی اور ناچ گانے کے کلچر کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔ پچھلے سال ۱۴ اگست کو مشرف صاحب خود بھی ایک محفل میں محوِ رقص ہو گئے اور اِس کے بعد اُنہوں نے اپنی تقریر میں علماء کو بھی ایسی ''روشن خیالی'' اختیار کرنے کی دعوت دی۔

ii) مخلوط معاشرت کو رواج دینا موجودہ حکومت کا ایک خاص مشن محسوس ہوتا ہے۔ دنیا کے کسی ملک میں بھی اسمبلیوں میں خواتین کے لیے ۳۳ فیصد نشستیں مختص نہیں۔ ہمارے ہاں ایسا کیا گیا اور قومی' صوبائی اور ضلعی اسمبلیوں کے لیے دس ہزار عورتوں کو ایک دم گھر سے باہر لے آیا گیا۔ خواتین کے گھر کی چار دیواری سے باہر نکلنے سے اور غیر مردوں کے ساتھ رابطہ میں آنے سے معاشرے میں بدکاری عام ہوتی ہے' شوہر اور بیوی کے درمیان اعتماد ختم ہوتا ہے اور خاندانی نظام برباد ہو جاتا ہے۔ میراتھن ریس کے ذریعے بھی عورتوں کو گھروں سے نکال کر سڑکوں پر دوڑایا جا رہا ہے۔

iii) مغرب کی مالی امداد سے کام کرنے والی مادّہ پرست این جی اوز کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔ یہ این جی اوز محبت کی شادیوں کی حوصلہ افزائی کر رہی ہیں' گمراہ کن نظریات کو فروغ دے رہی ہیں اور خدمتِ خلق کے پردے میں بے حیا کلچر کو عام کر رہی ہیں۔ یہ این جی اوز مختاراں مائی کو امریکہ لے گئیں اور عالمی سطح پر اُس کے ساتھ ہونے والی زیادتی کو خوب اچھالا گیا۔ ایک صاحب نے نوائے وقت میں بڑا اچھا کالم لکھا تھا کہ ''مختاراں مائی مختاراں مائیوں کے دیس میں''۔ امریکہ میں ہزاروں نہیں لاکھوں خواتین مختاراں مائیاں ہیں۔

قیامِ پاکستان کے منفی سبب ہندو دشمنی کے حوالے سے شرمناک طرزِ عمل

۱) مسئلۂ کشمیر پر U -Turn :

موجودہ حکومت نے مسئلۂ کشمیر پر پاکستان کے دیرینہ موقف سے پسپائی اختیار کر لی۔ پاکستان کا شروع سے موقف یہ تھا کہ بھارت کے ساتھ ہمارا اصل اختلاف مسئلۂ کشمیر پر ہے۔ بھارت کا موقف تھا کہ ہم دیگر معاملات' خاص طور پر باہم تجارت کے معاملہ کو آگے بڑھائیں' مسئلۂ کشمیر پر بعد میں بات کریں گے۔ ہمارے صدر صاحب ۲۰۰۲ء میں آگرہ گئے

اور مذاکرات کو درمیان میں چھوڑ کر واپس آ گئے' کیونکہ بھارت مسئلۂ کشمیر کو core issue تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ بھارت آج بھی اپنے موقف پر سختی سے قائم ہے کہ کشمیر ہمارا اٹوٹ انگ ہے۔ من موہن سنگھ نے بار بار کہا کہ مجھے میری قوم نے بھارت کی سرحدیں تبدیل کرنے کا اختیار نہیں دیا۔ یہ مشرف صاحب کے مُنہ پر من موہن کا طمانچہ ہے کہ میں تو قوم کے اختیار سے حکومت پر فائز ہوں جبکہ تم نے زبردستی حکومت پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ ہم نے بھارت کو خود موقع فراہم کیا اور اُس نے اربوں روپے خرچ کر کے کنٹرول لائن پر باڑ' جدید ترین کیمرے اور لائٹس لگا دی ہیں۔ کیا بھارت یہ سب ہٹا کر پاکستان کو کشمیر کا کچھ حصہ دے گا؟ ہم نے لچک دکھا کر مسئلۂ کشمیر پر اپنی پوزیشن کمزور کر لی ہے۔ بھارت نے ۵۸ سال سے کشمیر پر ناجائز قبضہ کیا ہوا ہے' اقوامِ متحدہ کی قراردادوں پر عمل درآمد کے لیے تیار نہیں اور سات لاکھ فوج کے ذریعے بربریت کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ ہزاروں کشمیریوں کو قتل کر دیا گیا' املاک کو تباہ کیا' خواتین کی عصمت دری کی گئی' لیکن اب بھی وہ اپنی ہٹ دھرمی پر اڑا ہوا ہے' پاکستان پر دہشت گردی اور دراندازی کے الزامات لگا رہا ہے اور آزاد کشمیر پر اپنی ملکیت کا دعویٰ کرتے ہوئے یہاں بھاشا ڈیم بنانے پر اعتراض کر رہا ہے' جبکہ ہم حق پر ہونے کے باوجود لچک پر لچک دکھا کر کمزوری کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور بھارت سے اُس کی خواہشات کے مطابق ''جامع مذاکرات'' کر رہے ہیں : ؎

دیکھ مسجد میں شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ
بتکدے میں برہمن کی پختہ زُنّاری بھی دیکھ!

کشمیر کا مسئلہ ہماری لچک کی وجہ سے اب مردہ ہو چکا ہے' جبکہ بھارت کی خواہش اور مفادات کی خاطر دیگر مسائل پر بات چیت بھی ہو رہی ہے اور پیش رفت بھی۔

۲) بگلیہار ڈیم کے مسئلہ پر نرمی :

بھارت ناجائز طور پر دریائے جہلم پر بگلیہار ڈیم تعمیر کر رہا ہے۔ یہ منصوبہ پنجاب کے کھیتوں کو چٹیل میدان بنانے کا اقدام ہے۔ ہم نے اِس مسئلہ پر بھی بھارت سے واجبی سا احتجاج کیا۔ بھارت سے مختلف مسائل پر مذاکرات بھی جاری ہیں' خیر سگالی کے وفود بھی آ جا رہے ہیں اور کھیلوں کے روابط بھی سرگرمی سے برقرار ہیں۔

۳) اکھنڈ بھارت کی طرف پیش قدمی :

بھارت کی دیرینہ خواہش ہے کہ پھر سے اکھنڈ بھارت وجود میں آئے۔ اُن کے لیڈر

بار بار کہہ رہے ہیں کہ دونوں مما لک کے درمیان soft boundries ہونی چاہئیں۔ہم نے کئی مقامات سے سرحدیں کھول کراُن کی یہ تمنا پوری کردی ہے۔ بھارت کے انتہا پسند لیڈر ایڈوانی اور جسونت سنگھ پاکستان میں آ کر کہہ گئے ہیں کہ دونوں ملکوں کے عوام مل کر رہنا چاہتے ہیں۔مشرقی پنجاب کا وزیرِ اعلیٰ کئی بار ہمارے پنجاب میں آ کر پھر سے ملاپ کی خواہش کا اظہار کر چکا ہے۔اُس کے بقول ہم ایک ہیں، ہماری زبان ایک ہے، ہمارا کلچر ایک ہے، ہم نے خواہ مخواہ تفریق کی لکیر کھینچی ہوئی ہے۔آخری بار جب آیا تو اُس کے ساتھ سکھوں کا ایک دستہ تھا جو سرحد عبور کرتے ہوئے نعرے لگا رہا تھا کہ ''اب راج کرے گا خالصہ اور کرے نہ کوئی''۔ ہم گرمجوشی سے اُن کا استقبال کر کے اور اُنہیں پھولوں کے ہار پہنا کر اُن کے ناپاک عزائم کی تائید کر رہے ہیں۔ بھارتی صدر نے کہا ہے کہ نوجوان ہمت کریں تو پاکستان اور بھارت کی پھر فیڈریشن قائم ہوسکتی ہے، لیکن ہم نے اِس کے جواب میں کسی ردّعمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔

۴) پاکستان کو بھارتی اشیاء کی منڈی بنانے کی سازش:

عالمی یہودی استعمار دنیا بھر میں کچھ Economic Regions اور Free Trade Zones قائم کرنا چاہتا ہے تا کہ آزادانہ تجارت کو فروغ دے کر مقامی صنعتوں کو تباہ کر کے ملٹی نیشنلز کی اجارہ داری قائم کی جاسکے۔اِسی حوالہ سے پاکستان کو بھارتی اشیاء کی منڈی بنانے کا منصوبہ ہے۔ بھارت بار بار پاکستان سے تقاضا کر رہا ہے کہ تجارت کے حوالے سے ہمیں favourite nation قرار دو۔ پاکستان، بھارت کی اِس خواہش کو پورا کرنے کے لیے ابتدا میں دونوں ملکوں کے درمیان ٹرین اور کئی مقامات سے بس سروس چلا رہا ہے تا کہ بعد میں انہی راستوں کو تجارتی مقاصد کے لیے بھی استعمال کیا جاسکے۔

۵) بھارتی ثقافت کا فروغ :

بھارتی ثقافت کا فروغ تو اِس ملک میں عرصہ سے جاری ہے۔ویڈیو کیسٹس کے ذریعے بھارتی فلموں کی فراوانی نے اِس حوالے سے مؤثر کردار ادا کیا ہے۔ ہمارا نوجوان ہندوستانی اداکاروں اور گلوکاروں کا پرستار اور اُن کی فلموں اور گانوں کا شوقین ہے۔اب تسلسل کے ساتھ بھارتی اداکار، گلوکار اور فنکار پاکستان آ کر محبت کے ترانے الاپ رہے ہیں۔اور اب تو بھارتی فلموں کی پاکستان میں نمائش کی اجازت بھی دی جارہی ہے۔

ہماری حکومت کے مندرجہ بالا اقدامات ہیں جنہوں نے ہماری نوجوان نسل کے دلوں سے ہندو دشمنی کے عنصر کو ختم کر دیا ہے۔اُن کے ناپاک عزائم اب بھی اُن کے سینوں میں موجود ہیں جن کا اظہار کبھی کبھی ہو جاتا ہے۔نواز شریف صاحب نے واجپائی صاحب کو لاہور بلایا اور بظاہر واجپائی صاحب نے بڑی محبت کا اظہار کیا۔نواز شریف صاحب نے ایک محفل میں کہا کہ کشمیر کے بغیر پاکستان نامکمل ہے تو واجپائی صاحب نے فوراً جواب دیا پاکستان کے بغیر بھارت نامکمل ہے۔قرآنِ حکیم نے ہمیں کتنا کھول کھول کر کافروں کی اِس دشمنی سے آگاہ کیا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا بِطَانَةً مِّنۡ دُوۡنِكُمۡ لَا يَاۡلُوۡنَكُمۡ خَبَالًا ؕ وَدُّوۡا مَا عَنِتُّمۡ ۚ قَدۡ بَدَتِ الۡبَغۡضَآءُ مِنۡ اَفۡوَاهِهِمۡ ۚ وَمَا تُخۡفِىۡ صُدُوۡرُهُمۡ اَكۡبَرُ ؕ قَدۡ بَيَّنَّا لَـكُمُ الۡاٰيٰتِ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ۝۱۱۸﴾ (آل عمران)

''مؤمنو! کسی غیر مسلم کو اپنا رازدان نہ بنانا' یہ لوگ تمہاری خرابی میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتے' اور چاہتے ہیں کہ تمہیں تکلیف پہنچے اُن کی زبانوں سے تو دُشمنی ظاہر ہو ہی جاتی ہے اور جو (بغض) اُن کے سینوں میں مخفی ہیں وہ کہیں زیادہ ہیں۔ اگر تم عقل رکھتے ہو تو ہم نے تمہیں اپنی آیتیں کھول کھول کر سنا دی ہیں۔''

۱۹۶۲ء میں چین اور بھارت کی جنگ کے دوران بھارت نے ہم سے درخواست کی کہ ہم اِس موقع سے فائدہ اٹھا کر کشمیر پر حملہ نہ کریں' بھارت جنگ کے بعد بات چیت سے اِس مسئلہ کو حل کر دے گا۔ہم نے بھارت کی درخواست قبول کر لی۔اِس کے برعکس بھارت نے ۱۹۷۱ء میں سقوطِ مشرقی پاکستان میں جو کردار ادا کیا وہ ہندوؤں کی مسلم دشمنی کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد اندرا گاندھی نے کہا تھا کہ ہم نے دوقومی نظریہ کو خلیجِ بنگال میں غرق کر دیا اور مسلمانوں سے اپنی ہزار سالہ شکست کا بدلہ لے لیا۔اندرا گاندھی نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر پاکستان کے کسی اور صوبے میں بھی مشرقی پاکستان جیسے حالات ہوئے تو بھارت وہی کردار ادا کرے گا جو اُس نے مشرقی پاکستان میں ادا کیا ہے۔بلوچستان کے حوالے سے بھی بھارت اپنی تشویش کا اظہار کر چکا ہے۔جب ہم نے اِس پر احتجاج کیا اور اِسے پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت قرار دیا تو بھارت نے ہمارے احتجاج کو مسترد کر دیا اور اپنی تشویش کو جائز قرار دیا۔

یہ ہیں ہندو دشمنی کے مظاہر' لیکن ہم نے اپنے مذکورہ بالا اقدامات کی وجہ سے اِس دشمنی پر پردہ ڈال دیا ہے اور گویا پاکستان کے قیام کے ایک جواز کو خود ہی ختم کر دیا ہے۔

پاکستان کی سالمیت کے خلاف اقدامات

ا) نائن الیون کے واقعہ کے بعد امریکہ کی غلامی :

نائن الیون کے واقعہ کے بعد امریکہ نے حکومتِ پاکستان کو دھمکی دی کہ فیصلہ کرو کہ تم ہمارے دوست ہو یا دشمن! اگر دوست ہو تو افغانستان کے خلاف کارروائی میں ہمارا بھرپور ساتھ دو۔ اُس وقت ہمارے پاس دو راستے تھے :

i) ہم امریکہ سے مطالبہ کرتے کہ ثبوت فراہم کرو کہ نائن الیون کے واقعہ میں افغانستان کی حکومت ملوث ہے۔ اگر ثبوت موجود ہیں تو ہم افغانستان کی حکومت سے تعلقات منقطع کرلیں گے، ورنہ ہم تمہارا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اب اگر امریکہ ہمارے خلاف کارروائی کا فیصلہ کرتا تو ہم بھی اِس نظریہ کے ساتھ کہ شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے، اپنے ایٹمی میزائلوں کا رُخ بھارت اور اسرائیل کی طرف کر دیتے۔ ہمارے پاس ایٹمی صلاحیت آخر کس مقصد کے لیے تھی؟ ہمارے میزائل کس کام کے لیے تھے؟ اگر ہمارے میزائلوں کا رُخ بھارت کی طرف ہوتا تو پھر بھارت کی جرأت نہیں تھی کہ وہ ہمارے خلاف کسی اقدام کا ساتھ دیتا۔ پھر ہمارے پیچھے طالبان بھی تھے، ایران بھی امریکہ کی دشمنی میں پیش پیش تھا۔ چین بھی قبول نہ کرتا کہ اِس خطہ میں اُس کے واحد قابلِ اعتماد اتحادی کے خلاف کارروائی ہو۔ بالفرض امریکہ کارروائی کرتا تو بھی اُس کا اِس سے زیادہ برا حشر ہوتا جیسا عراق میں ہو رہا ہے۔

ii) دوسرا راستہ یہ تھا کہ ہم امریکہ کی دھمکی سے ڈر جاتے اور اُس کے تمام مطالبات کو تسلیم کرلیتے۔ بدقسمتی سے ہم نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ امریکہ سے بغیر ثبوت طلب کیے طالبان حکومت کو نائن الیون کے واقعہ کا مجرم قرار دیا اور دینی و اخلاقی اصولوں سے غداری کرتے ہوئے امریکہ کے تمام مطالبات تسلیم کر لیے۔ اس کے نتیجے میں ہم پر فوری تباہی تو نہیں آئی لیکن آہستہ آہستہ ہم اپنی بربادی کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں۔ اُس وقت ہم نے اپنے اِس فیصلہ کی حسبِ ذیل مصلحتیں بیان کیں :

i) ملک کی سالمیت محفوظ رہے۔

ii) ہماری معاشی صورتحال بہتر ہو جائے۔

iii) ہماری ایٹمی صلاحیت محفوظ رہے۔

1

iv) مسئلۂ کشمیر کے حل کے لیے ہمیں امریکہ کی مدد حاصل ہو۔

اُس وقت ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے صدر مشرف صاحب سے کہا تھا کہ جن چار مقاصد کے لیے آپ امریکہ کے اتحادی بن رہے ہیں، اِن میں سے کوئی ایک مقصد بھی حاصل نہیں ہوگا۔ آپ فوری تباہی سے تو بچ جائیں گے لیکن رفتہ رفتہ آپ کو ہر محاذ پر کمزور کیا جائے گا۔ امریکہ کے پیچھے اسرائیل ہے جو پاکستان کے وجود کو اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے خطرہ سمجھتا ہے۔ لہٰذا پاکستان کے خلاف لازماً اقدامات ہوں گے۔ بعد کے واقعات نے محترم ڈاکٹر صاحب کے خدشات کو صحیح ثابت کر دیا۔

i) ملک کی سالمیت کا معاملہ یہ ہے کہ ہم پہلے صرف مشرقی سرحد سے خطرہ محسوس کرتے تھے، اب ہماری اچھی خاصی فوج مغربی سرحد پر بھی تعینات ہے۔ بلوچستان اور وزیرستان میں پاکستان کی سکیورٹی فورسز اپنے ہی لوگوں کے ساتھ جنگ میں الجھ چکی ہیں۔ امریکہ اِس حوالہ سے ہم پر مزید کارروائیاں کرنے کے لیے مسلسل دباؤ ڈال رہا ہے اور بصورت دیگر خود حملہ کرنے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔

ii) معیشت کا معاملہ یہ ہے کہ ایک طرف وزیر اعظم صاحب کہہ رہے ہیں کہ ہماری معیشت نے take off کر لیا ہے جبکہ سٹیٹ بینک کی سالانہ رپورٹ اور ملک میں بڑھتی ہوئی مہنگائی معیشت کی تنزلی کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔

iii) ایٹمی صلاحیت کے حوالے سے امریکہ نے ہم سے اقبالِ جرم کرا لیا کہ دنیا میں ایٹمی صلاحیت کے فروغ میں ڈاکٹر قدیر اور اُن کا نیٹ ورک ملوث ہے۔ ہم اپنے محسن ڈاکٹر قدیر کو میڈیا پر لے آئے، اُنہوں نے سب کے سامنے اپنی ''غلطی'' کا اعتراف کیا اور گویا اِس حوالے سے ہمارے خلاف امریکہ کی فائل بالکل مضبوط ہو چکی ہے۔ اِس بات کو جواز بنا کر امریکہ نے پاکستان کے ساتھ ایٹمی صلاحیت میں تعاون کے حوالے سے کسی قسم کے معاہدے سے انکار کر دیا۔

iv) مسئلۂ کشمیر پر امریکہ ہمارے موقف کی حمایت تو کیا کرتا، اُس نے ہمیں بھارت کے سامنے جھکنے اور اپنے دیرینہ موقف سے پسپائی اور لچک دکھانے پر مجبور کر دیا۔ صدر بش نے اپنے جنوبی ایشیا کے حالیہ دورے کے دوران بھارت یا پاکستان میں خطاب کرتے ہوئے مسئلۂ کشمیر کا ذکر تک نہیں کیا۔ مسئلۂ کشمیر کے حوالے سے امریکہ بھارت پر دباؤ تو کیا ڈالتا، اُس نے بھارت کو اپنا خاص حلیف قرار دے کر ایٹمی صلاحیت کے حوالے سے

تعاون کا معاہدہ کرلیا۔

۲)افغانستان میں پاکستان دوست حکومت کے خاتمہ میں تعاون:

پاکستان کے قیام کے بعد افغانستان میں طالبان کی حکومت وہ پہلی حکومت تھی جو پاکستان دوست تھی۔قیامِ پاکستان کے بعد اقوامِ متحدہ میں ہماری رکنیت کی مخالفت کرنے والا واحد ملک افغانستان تھا۔اُس کے بعد بھی افغان حکومتوں نے ہر موقع پر پاکستان کے مقابلہ میں بھارت کا ساتھ دیا۔یہ طالبان کی حکومت تھی کہ جس کی وجہ سے ہماری مغربی سرحد بالکل محفوظ ہوگئی۔صدر مشرف صاحب نے بھی کئی بار کہا کہ طالبان حکومت کے ساتھ دوستی ہماری ضرورت ہے' کیونکہ ہمیں بھارت کے مقابلہ میں دفاع کی depth افغانستان سے حاصل ہوتی ہے۔لیکن ہم نے ایک امریکی دھمکی پر افغانستان کے حوالے سے U -Turn لے کر پاکستان کی سالمیت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔اب افغانستان میں پاکستان دشمن حکومت قائم ہے جو پاکستان پر دراندازی اور دہشت گردوں کو پناہ دینے کا الزام لگا رہی ہے۔بھارت سے اِس حکومت کے تعلقات مستحکم ہو رہے ہیں اور صدر بش نے بھارت کو افغانستان کا سرپرست بننے کی درخواست کی ہے۔آج ہم امریکہ سے شکایات کر رہے ہیں کہ بلوچستان میں تخریب کاروں کو اسلحہ افغانستان کی طرف سے مل رہا ہے۔ بھارت قندھار اور جلال آباد میں اپنے قونصل خانوں کے ذریعے پاکستان میں دہشت گردی کے لیے منصوبہ بندی کر رہا ہے اور تربیت و وسائل فراہم کر رہا ہے۔

۳) بلوچستان میں آپریشن :

بلوچستان میں حالات انتہائی نازک صورت اختیار کر چکے ہیں۔یہ سرزمین بیش بہا معدنی ذخیروں سے مالا مال ہے۔گوادر کی بندرگاہ وسط ایشیا کی ریاستوں سے تجارتی سرگرمیوں کے لیے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔اِس بندرگاہ پر چین کی موجودگی امریکہ کے لیے ناقابلِ قبول ہے۔بلوچستان میں تخریب کاری ایک عالمی سازش کے تحت ہو رہی ہے جس میں بھارت اور امریکہ پیش پیش ہیں۔اِن حالات میں قوم پرستوں سے دشمنی مول لینا اور اُن سے مذاکرات و مصالحت نہ کرنا غیر دانشمندی ہے۔قومی اسمبلی اور سینٹ میں کمیٹیاں قائم کی گئیں لیکن اُنہوں نے کوئی قابلِ ذکر کام نہیں کیا۔

۴) سیاسی خلفشار :

پاکستان کے اندرونی استحکام کے لیے ضروری ہے کہ یہاں عوام کی منتخب کردہ حکومت ہو۔ جب بھی اِس ملک میں فوجی حکومت آئی ہے، صوبوں کے اندر احساسِ محرومی پیدا ہوا ہے اور اُن کے درمیان نفرتیں بڑھی ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ فوج کی اکثریت کا تعلق پنجاب سے ہے۔ مشرقی پاکستان فوجی حکومت کی وجہ سے علیحدہ ہوا اور اب بھی یہی کیفیت ہے۔ ہمارے ہاں اِس وقت بین الصوبائی انتشار عروج پر ہے۔ کالا باغ ڈیم کے حوالے سے تین صوبے ایک طرف ہیں اور پنجاب دوسری طرف ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ ملک میں ایک شخص کی حکومت ہے۔ اُس نے ۲۰۰۲ء میں عالمی دباؤ پر انتخابات کرائے لیکن پوری دنیا نے کہا کہ یہ انتخابات غیر منصفانہ تھے۔ اِس دھاندلی کے باوجود بھی جب اپنی مرضی کی حکومت تشکیل دینے کے لیے مطلوبہ اکثریت نہ ملی تو ایسے کرپٹ اراکینِ اسمبلی کی وفاداریاں دھمکیوں اور لالچ کے ذریعے تبدیل کرائی گئیں جن پر نیب کے ذریعے سے مقدمات قائم کیے گئے تھے۔ کہا گیا کہ اُنہوں نے اپنے ضمیر کے مطابق فیصلہ کیا ہے۔ اِس کے بعد اِن نیب زدگان کو ''پیٹریاٹ'' کا نام دے کر وزیروں کے منصب دے دیے گئے۔ ابتدا میں حکومت کو استحکام دینے کے لیے چھوٹے صوبے کے ایک شخص کو وزیرِ اعظم بنایا گیا۔ پھر امریکہ سے درآمد شدہ شخصیت کو وزیر اعظم بنانے کے لیے قومی اسمبلی کا رکن منتخب کرایا گیا۔ سینٹ کا چیئر مین بھی اپنے اعتماد کے ایک شخص کو بنایا گیا تاکہ صدر صاحب کی غیر موجودگی میں وہ قائم مقام صدر بن سکے۔ اِس طرح کی صورت حال دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں کہ باوردی شخص سیاہ وسفید کا مالک بن جائے اور پھر ملک میں جمہوریت کا راگ بھی الاپا جائے۔ کالا باغ ڈیم کے معاملہ پر اختلاف کی اصل وجہ ملک پر مسلط جابرانہ نظام اور شخصی آمریت کے خلاف احتجاج ہے۔ مشرف صاحب کی اِس وقت ساری توجہ ذاتی اقتدار کے تحفظ اور دوام پر ہے۔ اِس وقت ضرورت اِس بات کی ہے کہ تمام قابلِ ذکر سیاسی قوتوں کو اعتماد میں لیا جائے اور باہمی مشاورت سے ملک کو درپیش خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے منصوبہ بندی کی جائے۔

۵) اہم قومی اداروں کی نج کاری :

حساس نوعیت کے قومی اداروں کو فروخت کیا جا رہا ہے، جیسے PTCL ،NRL اور

پاکستان اسٹیل مل۔ یہ ادارے مالی اعتبار سے منفعت بخش بھی ہیں لیکن اِس کے باوجود اِن کی نج کاری کی جا رہی ہے۔

٦) پیٹرول/ڈیزل کی قیمتوں میں مسلسل اضافہ :

عالمی مالیاتی اداروں کے دباؤ پر پیٹرول‘ ڈیزل اور گیس کی قیمتوں میں مسلسل اضافہ کیا جا رہا ہے۔ گزشتہ دنوں عالمی مارکیٹ میں پیٹرول کی قیمتیں گرتی رہی ہیں لیکن یہاں ہر پندرہ دن بعد پیٹرول کی قیمت میں اضافہ کیا جاتا رہا ہے۔ اس مسلسل اضافہ کی وجہ سے ہر شے مہنگی ہوتی جا رہی ہے اور بالخصوص ملک کی زرعی اور صنعتی ترقی پر شدید منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

مستقبل کا بھیانک منظر

ہمارے مذکورہ بالا طرزِ عمل سے رفتہ رفتہ ہماری نئی نسل اِس سوچ کی حامل ہوتی جا رہی ہے کہ ہمیں بھارت کے ساتھ confederation کر لینی چاہیے‘ کیونکہ :

i) پاکستان کا بنانا بے مقصد تھا۔ جس طرح کا سیکولر طرزِ حکومت اور نظام بھارت میں ہے اُسی طرح کا پاکستان میں ہے‘ لہٰذا ہم نے خواہ مخواہ ہی ایک تفریق کی لکیر کھینچی۔

ii) بھارت میں نظامِ حکومت پاکستان سے بہتر ہے۔ وہاں حقیقی جمہوریت ہے‘ جاگیرداری نہیں‘ احتساب کا نسبتاً بہتر نظام ہے اور قانون کی صحیح عملداری ہے۔

iii) جرنیلوں‘ جاگیرداروں اور بیورو کریسی کے ظلم وستم اور لوٹ مار سے بین الصوبائی نفرتیں بڑھ رہی ہیں اور معاملہ خانہ جنگی کی طرف جا رہا ہے۔ بیرونی دشمن اِس خانہ جنگی کو مزید ہوا دے رہے ہیں۔ اِس صورتِ حال میں بہتر ہے کہ بھارت سے الحاق کر لیا جائے۔

iv) بھارت سے الحاق کی صورت میں کشمیر اور دریائی پانی کا مسئلہ دونوں ہی ختم ہو جائیں گے جن کی وجہ سے معاملہ ایٹمی جنگ تک جا سکتا ہے۔

یہ ہیں وہ حالات کہ جن میں بھارتی لیڈر محبت کے ترانے گاتے ہوئے پاکستانیوں کو پھر سے اپنے ساتھ ملنے کا پیغام دے رہے ہیں۔ اِس ناپاک منصوبہ کی تکمیل کے لیے بھارتی فلموں‘ ڈراموں‘ گانوں اور کرکٹ کے روابط نے ہمارے ہاں حالات سازگار کر لیے ہیں۔ اب ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ۵۸ برس پہلے ہم نے ہزاروں جانوں کی قربانی دے کر اور ہزاروں عصمتیں لٹا کر اسلام کے نام پر جو ملک حاصل کیا تھا وہ سب کا سب رائیگاں جائے گا۔

دوسری طرف صورتِ حال یہ ہے کہ ہمارے جرنیل‘ جاگیردار‘ سرمایہ دار اور

بیوروکریسی یعنی اشرافیہ کا طبقہ نہیں چاہتا کہ پاکستان کا بھارت کے ساتھ الحاق ہو۔ اُنہیں معلوم ہے کہ اِس الحاق سے اُن کی عیاشیاں اور لوٹ مار کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ اِسی لیے حکمران طبقہ ایٹمی صلاحیت کے حوالے سے امریکہ کے مطالبات نہیں مان رہا اور میزائل ٹیکنالوجی کو فروغ دے رہا ہے۔ لیکن اِس طبقہ کے سیاہ کرتوں نے پاکستان کو خاتمہ کے قریب کر دیا ہے۔ اب اگر اِس طبقہ نے بھارت کے ساتھ الحاق کے منصوبہ میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی تو امریکی وزیر خارجہ کہہ چکی ہے کہ پاکستان کے مستقبل کا فیصلہ امریکہ اور بھارت کریں گے۔ پاکستان میں امریکی سفیر نے کہہ دیا ہے کہ امریکہ اور بھارت کسی تیسرے ملک کے خلاف کارروائی کے لیے تیاری کر چکے ہیں۔ گویا اب پاکستان میں حالات کو مزید خراب کیا جائے گا اور پھر بزورِ طاقت پاکستان کو بھارت کے ساتھ الحاق پر مجبور کیا جائے گا۔ باجوڑ میں میزائل حملہ اور آئندہ کے لیے اِس طرح کے حملوں کو جاری رکھنے کا اعلان کر کے امریکہ نے اپنے عزائم کا اظہار کر دیا ہے۔

مسئلہ کا سب سے افسوسناک پہلو

سب سے زیادہ افسوس ناک معاملہ یہ ہے کہ : ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا!

کے مصداق ملک کے حالات خرابی کی انتہا پر ہیں، لیکن مجموعی طور پر ہمیں کوئی پریشانی اور فکر لاحق نہیں۔ جو ہماری بڑی سیاسی جماعتیں ہیں ان سے تو کوئی توقع نہیں، وہ تو خود چاہتی ہیں کہ اُنہیں امریکہ کی آشیرواد حاصل ہو اور وہ اقتدار تک پہنچ سکیں۔ کوئی امید تھی تو مذہبی سیاستدانوں سے تھی۔ اُن کا معاملہ بھی یہ ہے کہ وہ حکومت میں حاصل اپنا حصہ داؤ پر لگانے کو تیار نہیں۔ صوبہ سرحد میں مجلسِ عمل کے اراکین نے سینٹ کے انتخابات میں حکومت کو مطلوبہ نتائج کے حصول میں جو تعاون پیش کیا وہ انتہائی افسوسناک ہے۔ مولانا فضل الرحمٰن صاحب مشرف حکومت سے تعاون کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔ قاضی حسین احمد صاحب اُن کے راستہ میں رکاوٹ ہیں۔ مجلسِ عمل نے بھی اب تک سارا زور ایسے مسائل پر دیا ہے جن کا نفاذِ اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ ایل ایف او پر حکومت سے سمجھوتہ ہوا، دستور میں سترہویں ترمیم کے ذریعے مشرف حکومت کے تمام اقدامات کو تحفظ دیا گیا، لیکن اسلام کے حوالے سے کوئی بات

نہیں منوائی گئی۔ اِس وقت کوئی ایسی مؤثر تحریک نہیں جو حکومت کو اسلام اور ملکی سالمیت کے خلاف اقدامات سے روک سکے۔ ملک تباہی کی طرف بڑھ رہا ہے اور ہماری اکثریت کی کیفیت یہ ہے کہ :

نہیں لیتے کروٹ مگر اہلِ کشتی!
پڑے سوتے ہیں بے خبر اہلِ کشتی!

ضرورت اِس بات کی ہے کہ فوری طور پر وطنِ عزیز کو درپیش خطرات کے حوالے سے سوچ بچار کی جائے۔ اقبال اپنی نظم ''تصویرِ درد'' میں کہتے ہیں: ؎

وطن کی فکر کر ناداں ' مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
یہ خاموشی کہاں تک ' لذّتِ فریاد پیدا کر!
زمیں پر تو ہو' اور تیری صدا ہو آسمانوں میں !
یہی آئینِ فطرت ہے' یہی اُسلوبِ فطرت ہے!
جو ہے راہِ عمل میں گامزن' محبوبِ فطرت ہے!!

فوری علاج

☆ ملک کی تمام قابلِ ذکر سیاسی جماعتوں کے ساتھ مذاکرات کر کے اندرونی طور پر مفاہمت اور استحکام کی فضا قائم کی جائے۔
☆ بلوچستان میں سرداروں سے گفتگو کر کے مفاہمت کی راہ نکالی جائے۔
☆ ملک میں منصفانہ انتخابات کروا کر اقتدار منتخب نمائندوں کے حوالے کیا جائے۔
☆ باجوڑ کے واقعہ اور ایٹمی توانائی کے حوالے سے بھارت کے مقابلہ میں غیر منصفانہ سلوک کو بنیاد بنا کر امریکہ کی مزید فرمانبرداری سے معذرت کی جائے۔
☆ ایران کے ساتھ تعلقات کو مضبوط کر کے باہم دفاعی معاہدہ کیا جائے۔
☆ چین کے ساتھ تعلقات کو مزید مضبوط کر کے دفاعی روابط اور بڑھائے جائیں۔
☆ ہر شہری کے لیے عسکری تربیت کا حصول لازم قرار دیا جائے اور اسرائیل اور چین کی طرح

پاکستان میں بھی ''پیپلز آرمی'' قائم کی جائے۔

مسئلہ کا اصل حل

مسئلہ کا اصل حل یہ ہے کہ اللہ کی ناراضگی کو دور کیا جائے اور اُس کے حضور اپنے گناہوں سے سچی توبہ کی جائے۔ سورہ 'یونس' آیت ۹۸ میں بیان ہوا کہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم پر عذاب کے آثار نمایاں ہوگئے تھے۔ اُس قوم نے توبہ کی اور اللہ نے اُس پر سے عذاب کو ٹال دیا:

﴿فَلَوۡلَا كَانَتۡ قَرۡيَةٌ اٰمَنَتۡ فَنَفَعَهَاۤ اِيۡمَانُهَاۤ اِلَّا قَوۡمَ يُوۡنُسَ ؕ لَمَّاۤ اٰمَنُوۡا كَشَفۡنَا عَنۡهُمۡ عَذَابَ الۡخِزۡىِ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَمَتَّعۡنٰهُمۡ اِلٰى حِيۡنٍ ﴿۹۸﴾﴾

''تو کوئی بستی ایسی کیوں نہ ہوئی کہ ایمان لاتی تو اُس کا ایمان اُسے نفع دیتا' سوائے حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کے کہ جب ایمان لائی تو ہم نے دور کر دیا اُن سے دنیا کی زندگی میں ذلت کا عذاب اور اُنہیں ساز و سامان دیا ایک مدت تک کے لیے۔''

توبہ کے حوالے سے تین باتیں ضروری ہیں:

i) اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر اپنے گناہوں کی معافی مانگیں' عافیت کا سوال کریں اور اُس کی نصرتِ خاص کے لیے التجا کریں۔ خصوصاً رات کے پچھلے پہر اُٹھ کر تہجد کا اہتمام کریں اور اِس کے بعد انتہائی رقت سے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے در سے اُس کی رحمتوں کی بھیک مانگیں۔ اُس وقت اللہ تعالیٰ کی خاص تجلیات کا ظہور سماءِ دنیا پر ہوتا ہے اور اللہ پکارتا ہے:

((هَلۡ مِنۡ سَائِلٍ يُعۡطٰى؟ هَلۡ مِنۡ دَاعٍ يُسۡتَجَابُ لَهٗ؟ هَلۡ مِنۡ مُسۡتَغۡفِرٍ يُغۡفَرُ لَهٗ؟))

''ہے کوئی مانگنے والا کہ اُس کو عطا کیا جائے؟ ہے کوئی دعا کرنے والا کہ اُس کی دعا پوری کی جائے؟ ہے کوئی بخشش طلب کرنے والا کہ اُس کو بخش دیا جائے؟'' (مسلم)

ii) دعاؤں کی قبولیت کے لیے لازم ہے کہ ہم انفرادی اعتبار سے توبہ کریں' یعنی ہم پورے کے پورے اسلام میں داخل ہوں اور جہاں تک ہمارا اختیار ہے وہاں مکمل طور پر اسلامی تعلیمات پر عمل کریں۔ فرائض ادا کریں اور حرام سے بچیں۔ اپنے گھر کے ماحول کو باپردہ اور پاکیزہ بنائیں' گھر میں رزقِ حلال لائیں اور گھر سے فلموں' ڈراموں اور بے حیائی کا کلچر ختم کریں۔

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

اگر ہمارے مجموعی مجرمانہ طرزِ عمل کی وجہ سے خدانخواستہ ملک پر کوئی عذاب آتا ہے تو ہم سب اُس کی لپیٹ میں آئیں گے‘ لیکن روزِ قیامت وہ لوگ عذابِ اُخروی سے بچ جائیں گے جنہوں نے انفرادی زندگی میں توبہ کر لی تھی۔ ہر انسان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ روزِ قیامت ہمیشہ ہمیش کے عذاب سے بچ جائے۔ اِس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ فوری طور پر انفرادی توبہ کر لی جائے۔

iii) انفرادی توبہ کے ساتھ ساتھ دنیا میں عذاب سے بچنے کے لیے اجتماعی توبہ بھی ضروری ہے۔ بقول اقبال : ؎

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

اجتماعی توبہ یہ ہے کہ ہم کسی ایسی تحریک میں شامل ہوں جو منظّم انداز سے نفاذِ اسلام کی کوشش کر رہی ہو۔ وہ لوگوں میں حالات کی خرابی کا شعور اور احساسِ زیاں پیدا کر رہی ہو۔ حکومتِ وقت سے ہمدردانہ انداز میں اسلامی شعائر کے فروغ اور شریعتِ اسلامی کے نفاذ کا مطالبہ کر رہی ہو۔ اِس کے ساتھ ساتھ اپنی افرادی قوت کو بڑھا کر ایک مؤثر پریشر گروپ تشکیل دے رہی ہو جو مناسب تعداد کی فراہمی پر حکومت پر دباؤ ڈال سکے کہ اسلام اور پاکستان کی سالمیت کے خلاف اقدامات سے باز آ جاؤ ورنہ ہم پُر امن ایجی ٹیشن کے ذریعے تمہارا یہ نظام نہیں چلنے دیں گے۔ ہمارے سامنے ایران کی مثال ہے۔ ایران میں مغربی کلچر کو بہت فروغ حاصل ہو چکا تھا۔ وہاں ایک جماعت وجود میں آئی جس نے بادشاہ کے سیاہ کرتوتوں کے خلاف احتجاج کیا۔ لوگ سڑکوں پر آئے‘ ہزاروں افراد نے جانیں دیں اور آخر کار بادشاہ کو وہاں سے فرار ہونا پڑا۔ آج ایران واحد مسلمان ملک ہے جس میں غیرت وحمیت نظر آتی ہے اور وہاں کا صدر امریکہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حق بات کہہ رہا ہے۔

اگر ہماری مؤثر تعداد نے انفرادی واجتماعی توبہ کی تو پھر اللہ تعالیٰ کی مدد ہمارے شامل حال ہوگی‘ اور اللہ تعالیٰ کے ارشادات ہیں :

﴿اِنۡ تَنۡصُرُوا اللّٰهَ يَنۡصُرۡكُمۡ وَيُثَبِّتۡ اَقۡدَامَكُمۡ ۝۷﴾ (محمد)

''اگر تم اللہ کی مدد کرو گے وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدموں کو جما دے گا۔''

﴿اِنۡ یَّنۡصُرۡکُمُ اللّٰہُ فَلَا غَالِبَ لَکُمۡ ۚ وَ اِنۡ یَّخۡذُلۡکُمۡ فَمَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَنۡصُرُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِہٖ ؕ وَ عَلَی اللّٰہِ فَلۡیَتَوَکَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۶۰﴾﴾ (آل عمران)

''اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب نہیں آ سکتا' اور اگر وہ تمہاری مدد سے ہاتھ کھینچ لے تو اُس کے بعد کون تمہاری مدد کر سکے گا؟ اور چاہیے کہ اہلِ ایمان اللہ ہی پر بھروسہ کریں۔''

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم سب کو انفرادی و اجتماعی توبہ کی توفیق عطا فرمائے۔ صرف سننا اور سنانا آخرت میں ہمارے حساب کتاب کے معاملہ کو مشکل کر دے گا۔ اُس شخص کا جرم زیادہ بڑا ہے جس کو حقائق کا علم ہے لیکن اس کے باوجود وہ آگے بڑھ کر انفرادی اور اجتماعی توبہ کی طرف متوجہ نہیں ہو رہا۔

پاکستان کی موجودہ صورت حال کو سمجھنے کے لیے مطالعہ کیجیے:

پاکستان کے وجود کو لاحق

خطرات و خدشات

اور - بچاؤ کی تدبیر

مؤلف :

ڈاکٹر اسرار احمد

1

دعوت دین

توہینِ ناموسِ رسالت ﷺ سنگین جرم کیوں؟

انجینئر مختار حسین فاروقی

مغربی پریس میں پیغمبرآخرالزمان حضرت محمد ﷺ کے توہین آمیز خاکوں کی اشاعت پر حالیہ دنوں میں تمام عالم اسلام میں جس طرح کا ردّعمل سامنے آیا ہے اور شدید ترین احتجاج ہوا ہے' اور ابھی جاری ہے' وہ حالیہ تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس دوران مسلمان عوام نے جس طرح کے جذبات کا اظہار کیا ہے وہ ان نعروں اور بینرز کی عبارات سے ظاہر ہے جو احتجاجی مظاہروں اور جلوسوں میں سامنے آئے ہیں' جن میں سے چند بطور نمونہ یہ ہیں:

☆ توہین رسالت ﷺ سنگین جرم ہے۔
☆ توہین رسالت ﷺ کا مرتکب جہنمی ہے۔
☆ توہین رسالت ﷺ کا مرتکب واجب القتل ہے۔
☆ خاکوں کی اشاعت کرنے والوں کا علاج غازی علم دین شہید جیسے مجاہد ہیں۔
☆ توہین رسالت ﷺ یہودیوں کی سازش ہے۔
☆ خاکوں کی اشاعت مسلمانوں کی غیرتِ ایمانی کو چیلنج ہے۔
☆ توہین آمیز خاکوں کی اشاعت صلیبی جنگوں کا آغاز ہے۔

یہ نعرے اور اسی طرح کے جذبات کے اظہار کے دیگر الفاظ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کے نزدیک حضرت محمدٌ رسول اللہ ﷺ ایسی واجب الاحترام اور رفیع المرتبت ہستی ہیں کہ ان کی توہین کا سوچنا بھی جرم ہے' اور اپنے محبوب پیغمبر ﷺ کے دفاع کے لیے جان کا نذرانہ پیش کرنا زندگی کی سب سے بڑی آرزو اور سعادت ہے جس کے لیے ہر خاص و عام

مسلمان بے تاب و بے چین ہے۔

لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ کون سی خاص بات ہے جس کی وجہ سے حضرت محمد ﷺ کی بارگاہ میں سوئے ادب بھی جرم بن جاتا ہے؟ جسے ناقابل معافی کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ اس سوال کا جواب شاید ہر مسلمان کے دل میں تو ہو مگر اس کا کچھ معین الفاظ میں ڈھل کر زبان پر آ جانا اتنا عام بھی نہیں اور شاید اتنا آسان بھی نہیں۔

ان سطور میں اس بات کی وضاحت کی کوشش کی گئی ہے کہ نوعِ انسانی کے لیے حضرت محمد ﷺ کس طرح واجب الاحترام ہیں اور کسی دریدہ دہن کی زہرافشانی صرف مسلمانوں اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف ہی نہیں بلکہ انسانیت کے خلاف ہوتی ہے، اور ایسی حرکتیں کس طرح انسانیت کے خلاف کسی خبیث روح کا ظہور، کسی شیطانی الہام کا مظہر اور کسی گندے ذہن کی گندی سوچ کا مرقع بن کر شعورِ انسانی پر ایک سیاہ داغ چھوڑ جاتی ہے، جس کے اثرات نسلوں کو متأثر کر جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی ناپاک جسارتیں، جو بظاہر معصوم ہی محسوس ہوں، حقیقتاً سنگین نوعیت کا جرم اور سزائے موت (Capital Punishment) کی سزاوار سمجھی جاتی ہیں۔

ذرا ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں تو یہ سوچ صرف مسلمانوں کی اپنے پیغمبر ﷺ ہی کے بارے میں نہیں ہے، بلکہ تمام بانیانِ مذاہب جو حقیقتاً نہایت پاک سیرت اور اخلاق، عملی اور نجی زندگی کے اعتبار سے نہایت اعلیٰ معیار کے انسان تھے، ان سب کے بارے میں ان کے پیروکار یہی سوچ رکھتے ہیں کہ ان کی توہین سنگین جرم ہے۔ اور یہ بات انسانی لاشعور کا حصہ ہے کہ ان پیغمبر حضرات علیہم السلام کی توہین پر اُن کے پیروکاروں کو ویسا ہی اختیار اور حق مل جاتا ہے جیسا کہ آج دنیا کی خودساختہ عالمی طاقت امریکہ کو نشۂ اقتدار میں اپنے اقتدار کے لیے خطرہ بننے والے کسی فرد، گروہ یا ملک پر بغیر کسی پیشگی اطلاع کے کارروائی اور حملہ کا جواز حاصل ہو جاتا ہے۔ ایسی ہی کارروائی آج کی اصطلاح میں ''دہشت گردی'' ہے۔ اور یہی اصطلاح ٹھیک ان توہین آمیز خاکوں پر بھی صادق آتی ہے جن سے مسلمانوں میں غازی علم دین شہید کا کردار ادا کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ انہیں بھی ایسے دہشت گردوں سے نمٹنے کے لیے کسی پیشگی اطلاع اور وارننگ کی ہرگز ضرورت نہیں رہتی۔

....

تفصیل میں جانے سے پہلے ایک بات اور بطورِ تمہید سامنے رکھنا ضروری ہے کہ حضرت

محمد ﷺ کی عظمت اور مقام کا ادراک مغربی دانشوروں کو تو کما حقہٗ ہو ہی نہیں سکتا، ہم مسلمانوں کے ذہنوں میں بھی مقامِ مصطفیٰ ﷺ کا تصور دھندلا سا گیا ہے اور ہم بھی یقین و ایقان اور conviction کی دولت سے تہی دست نظر آتے ہیں۔ مغربی فکر اور فلسفہ میں کئی نسلوں سے جاری کوششوں کے نتیجے میں انسانی زندگی کو مذہب اور سیکولرازم میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اور مذہب کا اثر ونفوذ بھی گزشتہ ایک صدی میں کم ہو کر صرف عقائد (dogma)، عبادات (modes of worship) اور مذہبی وسماجی رسومات (social customs & rituals) تک محدود ہو گیا ہے، جبکہ زندگی کا وسیع تر گوشہ اجتماعی زندگی سمیت سیکولرازم کے زیر اثر آ گیا ہے اور یہ سوچ عالمی بن گئی ہے اور مسلمانوں کی بھی ایک قابل لحاظ تعداد اسی سوچ کی حامل ہی نہیں داعی و مبلغ بھی بن گئی ہے۔

ان حالات میں اہل مغرب حضرت محمد ﷺ کے مقام کا شعور اور vision ہی نہیں رکھتے تو آپ ﷺ کی عظمت کا شعوری اظہار کیسے کر سکتے ہیں! اس کے لیے ضروری ہے کہ انسانی زندگی کے جو گوشے آج مغرب نے اسلام دشمنی میں سیکولرازم کے ماتحت کر دیے ہیں ان کے بارے میں تعلیماتِ پیغمبر ﷺ کا جائزہ لیں اور گہرائی میں جائیں تو مجھے یقین ہے کہ ہر مسلم و غیر مسلم عظمتِ مصطفیٰ ﷺ پر عش عش کر اٹھے گا اور یہ حقیقت سامنے آئے گی جو ایک شعر میں ذرا سے لفظی تصرف کے ساتھ پیش خدمت ہے: ؎

ذرا انسان کو بیدار تو ہو لینے دو\
ہر شخص پکارے گا ہمارے ہیں محمدؐ

یوں تو انسانی زندگی ناقابل تقسیم وحدت ہے اور قدیم و جدید کا قصہ ہو یا ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ کی لکیر، یا ناخواندہ اقوام کا مفروضہ، انسانی زندگی ایک ہی طرح کے گوشوں میں پہلو بہ پہلو رواں دواں ہے۔ آج جن گوشوں کو مذہب کے اثرات سے پاک اور تجربہ و مشاہدہ کی بنیاد پر آزاد سمجھا جاتا ہے وہ اجتماعی زندگی کے تین گوشے ہیں: (۱) سیاسی گوشہ (۲) معاشی واقتصادی گوشہ (۳) سماجی و معاشرتی گوشہ۔

انسانی زندگی کی تاریخ میں مختلف ادوار میں انہی میں سے کوئی نہ کوئی گوشہ اہمیت کا حامل رہا ہے۔ پہلے معاشی گوشہ ذرا دبا ہوا تھا۔ سیاسی جبر اور ظلم کی وجہ سے انسانی شعور نے آنکھ کھولی، کروٹ بدلی اور اجتماعی جدوجہد کے نتیجے میں انقلابِ فرانس آیا۔ سیاسی میدان میں عظیم پیش رفت سامنے آئی اور جمہوریت نے رواج پایا۔ آج دنیا میں سیاسی گوشے کے ساتھ

سماجی اور معاشرتی گوشے بھی بہت نمایاں ہیں' تاہم سب سے زیادہ اہم پہلو معاشی اور اقتصادی ہے۔

....

انسانی تمدن کی تاریخ میں ظلم و جور کا وجود بہت پرانا ہے اور انسان کے چند بگڑے ہوئے (perverted) رویوں میں سے ایک اہم رویہ ہے۔ اس کے برعکس عدل و انصاف' برابری' کمزوروں کے ساتھ ہمدردی اور دکھی انسانیت کی خدمت بہت اعلیٰ انسانی رویے ہیں۔ تاریخِ انسانی میں روئے ارضی پر چند مختصر ادوار کو چھوڑ کر ظلم اور ناانصافی کا ہی دَور رہا ہے۔ تاہم یہ بات بھی بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ فرعون کا دربار ہو یا نمرود کا' اسکندر کی محفلِ امراء ہو یا خسرو پرویز کی عمائدین سلطنت کی مجلس' ہر دَور میں ظلم کے خلاف حق بات کہنے والے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں اور انسانی رویوں کو ظلم سے ہٹا کر انصاف اور برابری کی راہ پر ڈالنے کے لیے جان پر کھیلتے اور اپنا سب کچھ قربان کرتے رہے ہیں۔

ان مردانِ حق کو دنیا پہچانتی ہے۔ گزشتہ چار پانچ ہزار سال کی معلوم تاریخِ انسانی میں ایسے لوگوں میں وہ لوگ بہت نمایاں ہیں جو اپنے پیروکاروں میں نبی اور رسول (علیہم السلام) کہلائے۔ ایسے اہم اور جرأت مند انسانوں میں سے چند بہت ہی بڑے قابل احترام نام ہیں۔ حضرات نوح' ابراہیم' اسماعیل' یوسف' موسیٰ' داوٗد' سلیمان اور عیسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ یوں تو جناب ابراہیمؑ کے کارنامے اور جرأت آموز رویے کچھ کم قابل ستائش نہیں ہیں اور فرعون جیسے (امریکی ذہن رکھنے والے خود پرست) بادشاہ کے آگے حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت بھی کمزوروں کے لیے حوصلہ کا پیغام اور ناتوانوں' ضعیفوں' مظلوموں اور بے آسرا قیدیوں کے لیے روشنی کا مینار رہے ہے۔ ایسے کئی انبیاء (علیہم السلام) تو اسی پاداش میں قتل بھی کر دیے گئے۔ اور دنیا بھر کے غریبوں اور مظلوموں کا دل اس بات پر دکھتا ہے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسے فرشتہ صفت انسان کو کچھ مفاد پرستوں نے اپنی راہ کا پتھر سمجھ کر سولی پر لٹکانے کے لیے رومیوں کے حوالے کر دیا تھا۔ تاہم اس فہرست میں ذاتی سطح پر ظلم و جور کا نشانہ بننے والے اور جان گسل محنت کر کے کامیاب ہونے والے حق پرست انسان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بڑا نمایاں اور مرکزی تھا اور ہے' اور رہتی دنیا تک اسی طرح مرکزی اہمیت کا حامل رہے گا۔ اگرچہ ''The Hundred'' نامی کتاب کے عیسائی مؤرخ نے تو انسانیت کے اس محسن صلی اللہ علیہ وسلم کو نسل انسانی کا عظیم ترین اور قابل ترین فرد قرار دیا ہے' تاہم دیگر

مستشرقین اور غیر مسلم دنیا کے بیشتر اہل عقل و دانش نے حضرت محمد ﷺ کے پیروکار نہ ہوتے ہوئے بھی انہیں آزادی، مساوات اور عدل کا پیغمبر قرار دیا ہے۔

....

اس عظیم ترین ہستی ﷺ کے نظریات و خیالات کیا تھے؟ اور ان کی زندگی میں اور وفات کے بعد کیسے بروئے کار لائے گئے؟ اور نسل انسانی کو اُن تعلیمات سے کیا فائدہ حاصل ہوا؟ دنیا بھر کے تمام قابل ذکر عظیم انسان حضرت محمد ﷺ کی تعلیمات کی آفاقیت اور عملیت کے پیش نظر انہیں انسان کی فلاح کا نسخہ قرار دینے پر متفق ہیں۔ ان کی تعلیمات کا منبع اور سرچشمہ قرآن مجید ہے جو دنیا بھر میں گزشتہ چودہ صدیوں سے علمی اور مذہبی افق پر چمک رہا ہے۔ آپ ﷺ کی ہدایات اور تشریحات دیگر مستند کتب (کتب احادیث) میں بھی درج ہیں جن کو کمال دیدہ ریزی اور صحت کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے۔ آج بھی جو ذی شعور انسان ان کتب کا بے لاگ اور تعصّبات کے بغیر مطالعہ کرے گا وہ ان تعلیمات کی عظمت کا ویسا ہی اعتراف کرے گا جیسا کہ ماضی میں کیا گیا۔ آزمائش شرط ہے۔ ان کتب میں درج تفاصیل کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

☆ حضرت محمد ﷺ عرب کے محترم شہر مکہ (جہاں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کا بنایا ہوا بیت اللہ موجود تھا اور لوگ انہی دو پیغمبروں کی تعلیمات کے پیرو تھے) میں ایک معزز ترین خاندان میں پیدا ہوئے۔ (۵۷۱ء)۔

☆ اس ماحول کے مطابق پرورش ہوئی کہ والد کا سایہ پہلے ہی اُٹھ گیا تھا، والدہ بھی بچپن میں وفات پا گئیں۔ دادا عبدالمطلب اور بعد ازاں دو چچاؤں کی زیر کفالت رہے۔

☆ آپ ﷺ کا اخلاق و کردار بچپن سے ہی برائیوں اور منفی رویوں سے پاک تھا۔ غریب پروری، انسانی ہمدردی اور غمگساری کا پہلو نمایاں تھا۔ جوانی میں بکریاں چرائیں، پھر تجارت کی اور خداداد صلاحیتوں سے خوب نام کمایا اور منافع بھی۔

☆ آپ ﷺ کی اخلاقی حیثیت بہت اعلیٰ رہی۔ جھوٹ، بددیانتی، چوری، شراب، جوا اور سود سے مکمل طور پر بچے اور سچائی، خدمتِ خلق اور عدل و انصاف کے علمبردار بن کر اُس ماحول میں زندگی گزاری۔

☆ آپ ﷺ کی فیملی لائف بھی ایک کھلی کتاب ہے۔ عام مصلحین اور نامور انسانوں کے برعکس اور بادشاہوں، فاتحین اور لیڈروں کی نجی زندگی سے بہت مختلف زندگی گزارنے

والا یہ انسان جوانی میں بھی حضرت یوسف علیہ السلام (اور دیگر پیغمبروں کی طرح) ہر طرح کی جنسی آلودگی سے پاک رہا' اگرچہ اس معاشرے میں بھی بے راہ روی کے سارے ذرائع موجود تھے۔ ۲۵ سال کی عمر تک کاروباری اسفار اور مالی آسودگی کے باوجود ہر طرح کی اخلاقی آوارگی سے بچے رہے (جو کہ آج کی مغربی دنیا میں ناقابل تصور ہے) ۲۵ سال کی عمر سے لے کر ۵۳ سال کی عمر تک عملی زندگی میں صرف ایک عورت (حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا) کے ساتھ شادی شدہ زندگی گزاری۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے نجی گوشے بھی روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں۔ ان کی وضاحت ضمناً اس لیے ضروری ہے کہ پاک تعلیمات کے لیے پاک کردار شرط ہے' جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نمایاں ترین وصف رہا۔

☆ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری زندگی نکاح اور شادی کے معروف طریقے پر صرف بارہ خواتین کے ساتھ وقت گزارا اور نکاح اور ریکارڈ پر موجود خواتین کے علاوہ کسی قسم کے جنسی سکینڈل سے بالکلیہ پاک رہے۔ یہ بات بھی آج کے مغربی معاشرے میں ناقابل تصور ہے' جہاں راجے' مہاراجے' لارڈز' حکمران اور ارب پتی تاجر تو کیا ایک اوسط مغربی مرد یا عورت کے لیے فیملی لائف کا تصور ہی مصیبت ہے۔ اور ۵۰ سال کی عمر تک ایک عام امریکی شہری (ٹائم میگزین کی ایک سابقہ رپورٹ کے مطابق) ۱۰۰۰ مردوں یا عورتوں سے تعلقات قائم کرتا ہے۔ افسوس کہ بعد کے دَور میں بعض مسلمان خلفاء' حکمران اور امراء نے بھی یہی لائف سٹائل اختیار کرلیا۔ یہ اسی بات کا نتیجہ ہے کہ ۱۹۹۸ء میں امریکی صدر نے کہا تھا کہ پچاس فیصد سے زیادہ امریکیوں کو اپنے باپ کا نام معلوم نہیں' یعنی ان کی پیدائش غیر قانونی تعلقات کا نتیجہ ہے۔

☆ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چالیس سال کی عمر سے تریسٹھ سال کی عمر تک اپنی تعلیمات لوگوں کے سامنے پیش کیں۔ معاشرے کا ردّعمل بڑا ظالمانہ تھا۔ مذاق' استہزاء' خریدنے کی کوشش' کردارکشی' سوشل بائیکاٹ' قتل کا فیصلہ اور جلاوطنی جیسے رویوں سے سامنا رہا' مگر یہ پہاڑ کی سی استقامت رکھنے والا شخص صلی اللہ علیہ وسلم اپنے موقف پر قائم رہا اور کسی لالچ میں نہیں آیا۔

☆ مکہ سے مدینہ ہجرت کے بعد اپنے وسائل کو pool up کیا اور مکہ کے سرداران اور عوامی خون چوسنے والے طبقہ کے خلاف جنگیں کیں۔ صلح کی پیشکش پر صلح کی اور مکہ والوں کی طرف سے صلح توڑنے پر حملہ کر کے مکہ فتح کرلیا اور پرانا فیوڈل اور سرداری نظام ختم کر کے ایک نئے طرزِ حکومت اور سماجی اور اقتصادی نظام کی بنیاد رکھی۔

☆ آپ ﷺ کی معاشی زندگی اور لائف سٹائل نہایت سادہ اور شریفانہ تھا اور آپؐ کے رویوں سے مساواتِ انسانی اور عظمت انسانی ٹپکتی تھی۔

☆ آپ ﷺ نے اپنے پیروکاروں کی بھرپور تربیت کی اور انہیں اپنے رنگ میں رنگ دیا۔ دنیا کی بعض تحریکوں اور missions کے لیے تو شاید کسی خاص قسم کی اخلاقی تربیت کی ضرورت نہیں، بلکہ بے راہ روی، جنسی آوارگی اور لوٹ کھسوٹ جیسے رویے ایسے لوگوں کا سامانِ سفر ہوتے ہیں، مگر حضرت محمد ﷺ ایسے شائستہ cultured well mannered اور نفیس انسان تھے کہ جس کی مثال حضرات انبیاء علیہم السلام کے علاوہ مشکل ہے۔ انہوں نے اپنے پیروکاروں کے لیے بھی انہی خصوصیات اور معیارات کو اہم قرار دیا۔ لہٰذا دہائیوں اور سینکڑوں میں نہیں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں آپ ﷺ کے ایسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پیدا ہوئے، جو معاشرتی رویوں میں ہو بہو آپؐ کی نقل تھے۔ یعنی اتباعِ رسول ﷺ کا کامل نمونہ تھے۔

☆ آپ ﷺ نے وفات سے قبل ایک خطبہ میں انسانیت کے لیے ایک چارٹر دیا جو آج بھی نمونہ ہے اور UNO کا چارٹر اسی سے ماخوذ ہے، جس میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمام انسان برابر ہیں، ان میں کالے گورے کی بنیاد پر کوئی فرق نہیں ہوگا، بلکہ رنگ، نسل، زبان، جنس (sex)، پیشہ اور علاقہ کی بنیاد پر ہر قسم کے امتیازات کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اور تمام انسانوں کے لیے دوسرے انسانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو محترم قرار دے دی، سوائے کسی جرم اور جواز کے۔

☆ آپ ﷺ نے معاشی بددیانتی اور ناانصافی کے تمام راستے بند کر دیے۔ ''Chance money'' کی تمام صورتیں جوا، لاٹری، انعامی سکیمیں، سود، سٹہ (speculation)، بانڈز، Forward trading، اور جنسی اشتعال اور استحصال کے ذرائع (از قسم سنیما، ڈرامہ، فلمیں، بے حیائی، جنسی جرائم وغیرہ) پر پابندی لگا دی۔ انسانی محنت کی عظمت کا درس دیا۔ بنیادی طور پر معاشی جدوجہد کا مرد کو ذمہ دار ٹھہرایا اور عورت کو مستقبل کی انسانی قیادت کی تربیت کے لیے گھر کی ملکہ قرار دیا تاکہ عورت کی عفت و عصمت کی حفاظت ہو سکے۔ اور فرمایا: ''محنت مزدوری کرنے والا اللہ کا دوست ہے''۔

....

محمدؐ رسول اللہﷺ نے ایک وسیع علاقے کو فتح کر کے سابقہ حکمرانوں (جو انسان دشمن، عیاش، لٹیرے، جواری، ظالم اور منتقم مزاج تھے) کی جگہ ایسی مثال قائم کی کہ فتح مکہ کے وقت دشمن کو غیر مسلح کر کے سب کو معاف کر دیا۔ (برعکس امریکہ کی موجودہ فتح افغانستان اور عراق کے دلخراش واقعات کے) اور آپﷺ کے بعد آپؐ کے قریب ترین ساتھیوں نے معاملات کو عین اسی طریق پر (علیٰ منہاج النبوۃ) چلایا اور قیامت تک کے حکمرانوں کے لیے مثال بن گئے۔

آپﷺ نے ایک سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام کی بنیاد ڈالی جو عدلِ اجتماعی (Social Justice) کا ایک نظام تھا۔ جس میں:

☆ مساوات انسانی تھی اور رنگ، نسل، خون، ذات، پیشہ اور جنس کی بنیاد پر کوئی فرق روا نہیں رکھا جاتا تھا۔

☆ کمزور طبقات بالخصوص عورتوں کے لیے اعلیٰ حقوق کا اہتمام کیا گیا۔ نکاح یعنی عورت کی مکمل کفالت اور پردے کے احکام سے نسل انسانی کو تحفظ دیا گیا اور وراثت کے احکام دیے گئے۔ عورت کو وراثت، پراپرٹی اور تجارت کا حق دیا گیا۔

☆ معاشی جدوجہد بنیادی طور پر مرد کے ذمہ تھی، محنت کی عظمت تھی اور محنت کا معقول معاوضہ ملتا تھا۔ جہاں امراء سے زکوٰۃ لے کر ضرورت مندوں کو دی جاتی تھی، جہاں کوئی بھوکا نہیں سوتا تھا، جہاں معاشی استحصال نہیں تھا، جہاں کفالت عامہ کا نظام تھا اور روٹی، کپڑا، مکان، علاج اور تعلیم تمام شہریوں کے لیے (بشمول غیر مسلموں کے) حکومت کے ذمہ تھا۔

☆ انسان کے بنائے ہوئے قوانین نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق عدالتیں کام کرتی تھیں اور اس پر عمل درآمد ہوتا تھا۔ یعنی انسان، انسان پر حکمران نہیں بلکہ آئین اور قانون کی حکمرانی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی شریعت ناقابل ترمیم تھی، جس کی رو سے تمام انسانوں کو عدل و انصاف میسر تھا۔ انصاف آسان اور سستا تھا۔ مجرم کو سزا بہرصورت ملتی تھی اور مجرم بڑا اور حیثیت والا ہونے کی وجہ سے بچ نہیں سکتا تھا۔

....

اسی سیاسی، اقتصادی اور سماجی نظام کی برکت تھی کہ ۶۳۲ء تا ۶۶۰ء میں چار حکمرانوں کے دَور میں عدل وانصاف، مساوات، قانون کی حکمرانی اور کفالتِ عامہ کی ایسی نادر مثالیں

سامنے آئیں کہ انسان آج تک حیران ہے۔ اس دَور میں حضرت عمرؓ نے عراق فتح ہونے پر جاگیرداری کو اسلام کے خلاف قرار دیا اور مفتوحہ علاقوں کی زمینوں کو state lands قرار دیا، جس سے جاگیرداری نظام (Feudal system) کا خاتمہ ہوگیا۔ اسی نظام کی برکات اور merits ہیں کہ ڈنمارک اور سویڈن جیسے ممالک (جہاں حضرت محمدﷺ کی توہین کروائی گئی) میں ''عمرالڈ'' (حضرت عمرؓ کے نام سے ماخوذ) کے عنوان سے کفالتِ عامّہ کا ایک نظام جاری ہے جو حضرت محمدﷺ اور ان کے اوّلین پیروکاروں کی دُوررس نگاہوں، نیک نیتی اور عظمت کی دلیل ہے۔ یہ دَورِ خلافت ہی تھا جس میں کسی شہری کے ہاں فاقہ نہیں تھا۔ بچہ پیدا ہوتے ہی subsistance allowance جاری ہوتا تھا۔ جہاں بقول حضرت عمرؓ ایک کتا بھی بھوکا مرگیا تو عمرؓ جواب دہ تھا۔ جہاں ایک عورت زکوٰۃ کی رقم دینے کے لیے گھر سے نکلی تو کوئی لینے والا نہیں تھا۔ آسودہ حالی کا یہ عالم تھا۔

یہ وہ نظام تھا جو معاشی طور پر بہت کامیاب رہا اور آج بھی کامیاب ہوسکتا ہے، بشرطیکہ مسلمان بالخصوص اور مغرب بالعموم حضرت محمدﷺ کی تعلیمات کو پڑھے، سمجھے اور میرٹ پر فیصلے کر کے اسے اختیار کرے۔ مزید برآں اکیسویں صدی میں کم از کم کسی ایک ملک میں اس کے نفاذ کو برداشت کر کے اس کی برکات کو study کرے۔

....

یہی عدلِ اجتماعی کا وہ نظام تھا جسے اسلام کی برکات کے ضمن میں خلافت راشدہ کا نام دیا گیا۔ اسی نظام کو لے کر جب مسلمان ایران پہنچے تو اس سوال کے جواب میں کہ عرب کے صحرا سے مسلمان کیوں اٹھ کر وقت کی ایک سپر پاور کو تہس نہس کرنے پر تل گئے ہیں، فرمایا: ''ہم (خود نہیں آئے بلکہ) ذمہ داری دے کر بھیجے گئے ہیں کہ انسانیت کو (فکری) اندھیروں سے نکال کر (شعور کی) روشنی میں لائیں اور بادشاہوں کے ظلم اور لوٹ کھسوٹ سے نکال کر اسلام کے عدل میں لے آئیں''۔

اسلام اور تعلیماتِ محمدیﷺ کا یہ تصور ہی کچھ لوگوں کے لیے راستے کی رکاوٹ ہے۔ اسلام اور خلافت کے نظام کا عدل وانصاف، مساوات اور آزادی کے ہم معنی ہونا ہی حقیقت اسلام ہے۔ تقریباً ایک صدی قبل مولانا حالؔی نے مسدس حالی میں فرمایا تھا: ؎

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا

وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا

قرآن مجید میں آپ ﷺ کو رحمت للعالمین فرمایا گیا ہے۔ اس نظامِ عدل وقسط کا قیام ہی آپ ؐ کی شانِ رحمت للعالمینی کا مظہر ہے جس سے اب مخلوق فائدہ اٹھا رہی ہے۔ اور اگر ظلم اسی طرح بڑھتا رہا تو دنیا اسلام کو خود بڑھ کر اپنا لے گی اور اس کی برکات سے عنقریب پوری دنیا پر اسلام کے غلبے کے بعد فائدہ اٹھائے گی۔

....

اس عادلانہ نظام کے منافع اور merits پر تاریخ گواہ ہے' زمانہ شاہد ہے اور ہزار ہا تصانیف موجود ہیں۔ اس کی برکات کی گواہی صدیوں وسطی ایشیا' سپین' جنوبی افریقہ اور ترکستان کے بام و در دیتے رہیں گے۔ اس نظام کو جاری کرنا انسانی خدمت اور کمزور کرنا انسان دشمنی ہے۔ حضرت محمد ﷺ نے یہ احساس بھی اپنے پیروکاروں کو دیا کہ اس عادلانہ نظام کو کمزور کرنے والا شخص محض ان کا دشمن نہیں درحقیقت انسانیت کا دشمن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دورِ نبوت کے آخری دنوں میں اور دورِ ابوبکر رضی اللہ عنہ (۶۳۲ء۔۶۳۴ء) میں اسود عنسی وغیرہ افراد نے اس عدلِ اجتماعی کے نظام کو درہم برہم کرنے کی کوشش کی تو محمد ﷺ کے جان نثاروں نے اس کی سرکوبی کی اور اس فتنے کو دبا دیا اور جھوٹے مدعیانِ نبوت کا ہمیشہ کے لیے قلع قمع کر دیا۔

اس عادلانہ نظام میں کفالت عامہ کے حقیقی تصور پر مبنی سیاسی اور سماجی ڈھانچہ درحقیقت انسانیت کے لیے ایک نعمت اور انسانی ترقی کی معراج ہے۔ اس انسانی معراج کو چند خودغرض اور انسان دشمن لوگ اپنے لوٹ کھسوٹ کے پروگرام کے راستے کی رکاوٹ سمجھتے ہیں اور اس کو disgrace کرنے' بے وقعت کرنے اور ناقابل عمل بنانے کے درپے رہتے ہیں' اور آخری حربے کے طور پر اس نظام کو لانے والے اور متعارف کرانے والے حضرت محمد ﷺ کی ذاتی زندگی (جس پر کیچڑ اچھالا تھا کبھی سلمان رشدی نے جو آج بھی برطانیہ کی گود میں بیٹھا ہے) کو داغدار کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں تاکہ حضرت محمد ﷺ کی کردار کشی ہو اور لوگ ان کے مقام کو پہچاننے اور ان کے لائے ہوئے نظام کو اپنانے کی بجائے اپنی نظروں سے گرا دیں۔ اسی phenomenon کی مثالیں وقتاً فوقتاً مغربی پریس میں سامنے آتی رہتی ہیں۔

....

حالیہ توہین آمیز خاکے بھی اس عدلِ اجتماعی کے نظام کو انسانیت کی نگاہوں سے اوجھل کرنے اور یورپ و امریکہ میں تیزی سے پھیلتے ہوئے اسلام کا راستہ روکنے کے لیے وضع کیے گئے پروگرام کا حصہ ہیں۔ یہ مجرد پریس اور چند کارٹونسٹوں کی کوشش نہیں ہے' بلکہ ایک مافیا اور master mind ہے جو اس کو لے کر آگے چلنا چاہتا ہے' اور دنیا پر New World Order کے ذریعے چند انسانوں کی حکومت قائم کر کے سارے معاشی وسائل کو قبضے میں لینا چاہتا ہے' جبکہ WTO اور WB اور IMF کے مارے ہوئے عوام ایک عادلانہ' منصفانہ اور کفالتِ عامہ کے تصور پر مبنی معاشی نظام کی تلاش میں ہیں۔ دیکھئے عوام جیتتے ہیں یا یہ مافیا!

یہ مافیا کون لوگ ہیں؟ اور کہاں ہیں؟ اس کا سراغ لگانے کے لیے بھی ٹھنڈے دل سے غور کرنا ہوگا۔ یوں تو دنیا میں ہر وہ طبقہ جو دوسروں کی کمائی پر نگاہ رکھتا ہے اور مستقل طور پر اس کو لوٹ کر اپنا مفاد حاصل کرتا ہے وہ اس مافیا میں شامل ہے۔ اس میں عام طور پر حکمران طبقہ' جاگیردار طبقہ' بہت سارے کلب اور تجارتی ادارے شامل ہیں' حتیٰ کہ کافی مذہبی گروہ بھی اسی طبقہ کا حصہ ہیں' جو دنیا میں عادلانہ اور Social Justice کے نظام کو اپنے مذموم مقاصد اور اپنی عیش پرستی کے لیے موت کا پیغام سمجھتا ہے۔ اس میں شاید مشرق و مغرب کی بھی کوئی تقسیم نہیں ہے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ دنیا بھر کے سچائی کے قدردان اُٹھ کھڑے ہوں' انصاف کے علمبردار میدان میں کود پڑیں' مظلوم و مقہور طبقات سر پر کفن باندھ لیں' تھرڈ ورلڈ کے عوام اور غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارنے والے ممالک کے عوام نکل کھڑے ہوں کہ دنیا میں عدل و انصاف کا قیام ہی ان کے مسائل کا حل ہے تو کرۂ ارض پر قتل و غارت' بے سکونی' بے اطمینانی' بے حیائی اور محرومیوں کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ بصورتِ دیگر عالمی مافیا کا یہ عفریت جلد ہی ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لینے والا ہے۔

اس ضمن میں سب سے زیادہ ذمہ داری ان حضرات کی ہے جو حضرت محمدﷺ کے پیروکار ہیں اور ان سے محبت کرتے ہیں کہ وہ اپنی وفاداری کا حق ادا کرنے کے لیے کمربستہ ہو جائیں اور اپنی وفا کا قبلہ روپے پیسے اور ڈالر کی بجائے تعلیماتِ محمدیﷺ کو بنائیں۔ مغرب کے نظریات (بے حیائی' عریانی' آزاد خیالی وغیرہ) کو ردّ کر کے امانت' دیانت اور شرافت کا پیکر بن جائیں اور دہر میں اسم محمدﷺ سے اُجالا کرنے کا فریضہ سرانجام دیں۔ یہ

وقت کی پکار ہے' اور وقت کی ضرورت ہے! اور مغربی یلغار کا علاج ہے۔

....

وہ عالمی مافیا جو حضرت محمد ﷺ کی تعلیمات اور ان کے لائے ہوئے عادلانہ نظام کا دشمن ہے' اس کا پہچاننا مشکل ہے۔ تاہم کچھ لوگوں کی رائے میں (اور وہ اہم ہے) کہ یہ مافیا نیو ورلڈ آرڈر کے نام سے کام کر رہا ہے اور دنیا بھر کے ارب پتی یہودی اس کی پشت پر ہیں۔ اور قابل افسوس بات ہے کہ امریکہ بطور ملک' امریکی بطور عوام اور امریکی حکومت اس مافیا کے اسی طرح فرمانبردار ہیں جس طرح افغانستان کا حکمران کرزئی امریکی حکومت کے سامنے سرنگوں رہتا ہے۔

....

ایک اور بات کی طرف اشارہ بھی شاید بہت سے عقلمندوں اور ذی شعور لوگوں کو فائدہ دے جائے۔ آپ کبھی امریکی کرنسی میں ایک ڈالر کا نوٹ دیکھیں تو آپ کو اس عالمی مافیا کے کچھ نشانات ملیں گے۔ اس ایک ڈالر کے نوٹ پر ایک طرف ۱۷۷۶ء کے ساتھ تحریر ہے: Ordo Novo Seclorum یعنی ''سیکولر بنیادوں پر نیو (ورلڈ) آرڈر''۔ اور یہ سوچ ۱۷۷۶ء یعنی امریکہ میں آئینی حکومت کے آغاز کے ساتھ ہی سے ہے اور موجودہ امریکی آئین وروایات' حکومت' میڈیا' عوام اور مذہب کا حصہ ہے۔ اس سے شاید آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ وہ عالمی مافیا جو حضرت محمد ﷺ کی دشمنی پر جی رہا ہے اور اس عادلانہ نظام کو انسانیت کی نگاہوں سے اوجھل کرنا چاہتا ہے کہ وہ کہیں آشکارا ہو کر دکھی انسانوں کے دلوں کی آواز نہ بن جائے' امریکہ میں کہیں چھپا ہوا ہے۔ اگر آج دنیا ایک گلوبل ویلج ہے تو دوسرے ممالک میں بھی اس کے اثرات پھیل رہے ہوں گے۔ مزید غور فرمائیں تو اسی ایک ڈالر کے نوٹ پر دوسری طرف دیکھیں تو اہرامِ مصر کی تصویر ہے' جس کے عین اوپر ایک انسانی آنکھ بنی ہوئی ہے۔ بھلا امریکہ کا اہرامِ مصر سے کیا تعلق؟ دماغ پر زور دیں' یہ بنی اسرائیل یعنی یہود ہیں جو کبھی مصر میں فرعون کے غلام تھے' اور اہرامِ مصر کی تعمیر میں جبراً کام کر رہے تھے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نیو سیکولر ورلڈ آرڈر دراصل یہود کا نظام (Jew World Order) ہے۔ یہی یہود ہیں جو سودی نظام پر قابض ہو کر دنیا بھر کے کاروبار پر چھائے ہوئے اور ارب پتی ہیں (ڈالرز میں)۔ اسرائیل ملک کا شوشہ انہوں نے چھوڑا' ملک بنایا اور اب اس ملک کو Greater Israel میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں اور ساری دنیا کے وسائل پر قبضہ رکھنا چاہتے ہیں۔

....

صاف ظاہر ہے کہ نہایت قلیل تعداد (۱۳ملین) یہود کی آبادی پوری دنیا پر کسی جمہوری اصول سے حکومت نہیں کر سکتی' لہٰذا سیکولر سوچ کے ساتھ نیو ورلڈ آرڈر اور عالمی زراعت اور کاروبار پر WTO کے ذریعے قبضے کا خواب دیکھا گیا ہے جواب روبعمل آ رہا ہے۔ اس منصوبے کے راستے میں رکاوٹ پاکستان (مسلمان ایٹمی طاقت) محمد عربی ﷺ کے غلام کہلانے والے مسلمان اور ان کے رہنما یعنی حضرت محمد ﷺ کی آفاقی تعلیمات ہیں۔ اس رکاوٹ کو دور کرنے کا ایک حل اس مافیا نے سوچا ہے کہ ایک تیر سے تین شکار کر لیے جائیں۔ (۱) عظمتِ مصطفیٰ ﷺ کو پارہ پارہ کر دیا جائے۔ (۲) مسلمانوں کے دل سے حضرت محمد ﷺ کی ناموس پر مر مٹنے کا جذبہ سرد کر دیا جائے۔ (۳) ان کی تعلیمات کو اپنی دانست میں داغدار اور آج کی اصطلاح میں ''دہشت گردی'' سے جوڑ کر بے وقعت کر دیا جائے۔

یہ ہے ان کارٹونوں اور ٹی شرٹوں پر ان خاکوں کی پرنٹنگ کا مفاد۔ ابھی اس منصوبے کا اور بہت کچھ سامنے آنے والا ہے۔ ان خاکوں کے پیچھے اس مافیا کو پہچاننے کی ضرورت ہے کہ جس نے ان کارٹونسٹوں کو خرید کر ان سے کام کرایا' خوب معاوضہ دیا' وعدے کیے اور مراعات دیں۔ مسلم اُمت یہ مطالبہ کر رہی ہے کہ وہ کارٹونسٹ اور اخبار کا مدیر معافی مانگے' مگر وہ تو خریدے جا چکے' وہ کیسے معافی مانگیں گے؟ وہ تو ایک لحاظ سے یہود کے دام میں آ کر پھنس چکے ہیں۔ نہ پیسے واپس کر کے ضمیر کی آواز پر اپنے کیے پر نادم ہو سکتے ہیں اور نہ ہی اپنے پیچھے چھپے مافیا کی خبر دے سکتے ہیں۔

ایک جرم ہوتا ہے' ایک اعانتِ جرم۔ اس اخبار کے ایڈیٹر اور اگلے درجے میں اس ملک کے وزیراعظم اور عوام سب مجرم ہیں' مگر سب سے بڑا مجرم مافیا ہے جو اس کے پس پردہ ہے اور جس کو پہچاننے کی ضرورت ہے۔ اور صرف مافیا کو پہچاننے کی نہیں اس کے خوفناک عزائم کو پہچاننے کی ضرورت ہے' اس کے ہتھکنڈے (tools) پہچاننے کی ضرورت ہے اور یہ کہ کون کون سا ملک' ادارہ اور حکمران اس مافیا کے ہاتھ استعمال ہو رہا ہے۔ (صدر بش نے توہین آمیز خاکے شائع کرنے والے ملکوں کو حوصلہ دیا کہ وہ معافی نہ مانگیں' وہ ان کے ساتھ ہیں)۔ پھر اس پر اکتفا نہیں' اس مافیا کے عزائم پہچاننے کی ضرورت ہے اور باضمیر اور سچا مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان عزائم کو پہچان کر ان کو ننگا کرنے اور دوسروں کو باخبر کرنے کی کوشش کرنا بھی ضروری ہے۔

....

تو آج جو شخص بھی حضرت محمد ﷺ کی توہین کا مرتکب ہے‘ یا ان کا نام اہانت کے انداز میں لیتا ہے یا ان کی تعلیمات کا مذاق اڑاتا ہے‘ وہ دانستہ یا نادانستہ توہینِ ناموسِ رسالت میں ملوث ہے۔ اور اس توہین کا مطلب ہے کہ وہ حضرت محمد ﷺ کے لائے ہوئے آزمودہ نظامِ عدل وقسط (System of Social Justice) کو نگاہوں سے گرانے کا مجرم ہے اور انسانیت کو نیو ورلڈ آرڈر کے لٹیرے ہاتھوں میں دینا چاہتا ہے۔ لہٰذا ایسا شخص صرف مسلمانوں ہی کا نہیں بلکہ انسانیت کا دشمن ہے اور انسانیت اور انسانی خون کا پیاسا ہے‘ جو انسانیت کا معاشی قتل کر کے خود عیش وعشرت کی محفلیں سجانے کی فکر میں ہے۔

ہر باغیرت‘ ہوش مند اور بااصول انسان کو آج سوچ سمجھ کر آئندہ قدم اٹھانے کی ضرورت ہے کہ اس کا آئندہ قدم اور مستقبل کا لائحہ عمل کہیں اس کو اور پوری انسانیت کو ایک لمبے عرصے کے لیے یہودی نیو ورلڈ آرڈر کی گود میں ڈالنے کا سبب تو نہیں بن رہا‘ اور یہ احساس اجاگر کرنے کی ضرورت ہے کہ کاش میں تعلیماتِ مصطفیٰ ﷺ کو عام کر کے انسانی فلاح اور عدل وانصاف کے اس عالمی نظام کو عام کرنے میں اپنا حصہ ڈال سکوں تو شاید میں انسان دوست اور ماحول دوست اور انصاف پسند اور اعلیٰ انسانی اقدار کا قدردان شمار ہو سکوں ......اور اگر ایسا ہو تو یہ بہت بڑی کامیابی ہوگی۔

....

شانِ رسالت ﷺ کی یہی عظمت ہے جس کا ہر مسلمان کو احسان مند ہونا چاہیے‘ اور یہی آپ ﷺ کی شانِ رحمۃ للعالمینی ہے‘ جس سے غیر مسلم بھی مستفیض ہوں گے‘ جس کا ان کو معترف ہونا چاہیے۔ قرآن مجید میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ انہیں محسن انسانیت ﷺ کے اس احسانِ عظیم کے تصور کے پیشِ نظر ہر دم ان کا احسان ماننا چاہیے اور ان پر درود وسلام بھیجنا چاہیے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۵۶﴾﴾ (الاحزاب)

’’بیشک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے (اس) خاص نبی (حضرت محمد ﷺ) پر درود بھیجتے رہتے ہیں (اور بھیجتے رہیں گے)۔ اے ایمان والو! (تمہاری وفاداری کا تقاضا یہی ہے کہ) تم بھی ان (ﷺ) پر درود بھیجتے رہو اور سلام بھی جیسے (وفاداری کا حق بنتا ہے) سلام بھیجنا۔‘‘

اور ایک دوسرے مقام پر آپ ﷺ کی شان کا ذکر ہے اور آپ ﷺ کے بدخواہوں (یعنی آپؐ کے لائے ہوئے نظام کے دشمنوں) کی ابتری کا۔ ملاحظہ کیجیے:

﴿اِنَّـآ اَعۡطَيۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَؕ۝۱ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانۡحَرۡؕ۝۲ اِنَّ شَانِئَکَ هُوَ الۡاَبۡتَرُ۝۳﴾ (الکوثر)

''بیشک ہم (اللہ جل جلالہ) نے آپ (ﷺ) کو (عظیم ترین نعمتوں کی) کثرت عطا فرما دی ہے۔ پس آپ (ﷺ) اپنے مربی (عطا کرنے والے کی رضا جوئی) کے لیے نماز ادا فرمائیں اور (اس کے مزید تقرب کے لیے قربانی کے) جانوروں کے خون (کی طرح اپنے وسائل بھی) بہا دیں۔ بیشک آپ (ﷺ) کا ہر مدّ مقابل ہی ابتر رہے گا''۔

یہ وہ rationale اور منطق ہے جس کی رو سے اولادِ آدمؑ کے اس کامل ترین سپوت ﷺ کے ساتھ دوسرے انسانوں کا معاملہ ایک انسان کا دوسرے انسان جیسا نہیں ہے جہاں بے جا ہنسی مذاق' بے ادبی' گستاخی' تلخ کلامی اور ناحق لڑائی کے مواقع آتے رہتے ہیں' بلکہ ایک خاص الخاص انسان سے بڑھ کر ایک ایسے محسن اعظم کا ہے جس کے سامنے (احسان مندی کے اعتراف کے طور پر) ہمارے سر جھکے رہنے چاہئیں اور زبان پر ان کی تعریف اور احسانات کا تذکرہ رہنا چاہیے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے خود ارشاد فرمایا:

((رَغِمَ اَنۡفُ رَجُلٍ ذُکِرۡتُ عِنۡدَهٗ فَلَمۡ یُصَلِّ عَلَیَّ))[1]

''جس کے سامنے میرا نام لیا جائے (یا آئے) اور وہ (احساسِ ممنونیت سے) درود نہ بھیجے وہ شخص تباہ ہوگیا''۔

ایک دوسرے فرمان میں ایسا شخص بخیل قرار دیا گیا ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہو' احسان فراموشی اور احسان ناشناسی جرم ہی ایسا ہے۔ **اعاذنا الله من ذلک!**

اللهم صل علی محمد عبدک ورسولک وصل علی المؤمنین والمؤمنات والمسلمین والمسلمات

(۱) سنن الترمذی' کتاب الدعوات' باب قول رسول الله ﷺ رغم انف رجل......

دعوت فکر

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر

عتیق الرحمٰن صدیقی

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ۝۲﴾ (الحُجُرات)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنی آوازوں کو نبی کی آواز سے بلند نہ کرو اور نہ نبی کے ساتھ اونچی آواز سے بات کیا کرو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا کیا کرایا سب غارت ہو جائے اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔''

اس سے پہلے سورۃ الفتح میں حضور نبی کریم ﷺ کے عُلوّ مرتبت اور رفعتِ شان کو بیان کیا گیا ہے اور آپؐ کی رسالت پر اللہ نے گواہی ثبت کی ہے اور یہاں رسول ذی شان کی توقیر و تعظیم کا حکم دیا گیا ہے اور ادب و احترام کا سلیقہ اور قرینہ سکھایا گیا ہے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

''اس کا منشا یہ تھا کہ حضور ﷺ کے ساتھ ملاقات اور بات چیت میں اہل ایمان آپؐ کا انتہائی احترام ملحوظ رکھیں، کسی شخص کی آواز آپؐ کی آواز سے بلند تر نہ ہو۔ آپؐ سے خطاب کرتے ہوئے یہ لوگ بھول نہ جائیں کہ وہ کسی عام یا اپنے برابر والے سے نہیں بلکہ اللہ کے رسول سے مخاطب ہیں ...... مگر بعد کے لوگوں کو بھی ایسے تمام مواقع پر یہی ادب ملحوظ رکھنا چاہیے، جب آپؐ کا ذکر ہو رہا ہو یا آپؐ کا کوئی حکم سنایا جائے، یا آپؐ کی احادیث بیان کی جائیں ...... مگر رسول اللہ ﷺ کے احترام میں ذرا سی کمی بھی اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس سے آدمی کی عمر بھر کی کمائی غارت ہو سکتی ہے، اس لیے کہ آپؐ کا احترام دراصل اُس خدا کا احترام ہے جس نے آپؐ کو اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے اور آپؐ کے احترام میں کمی کے معنی خدا کے احترام میں کمی کے

ہیں''۔(تفہیم القرآن' جلد پنجم)

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اس آیۂ کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''یعنی حضورﷺ کی مجلس میں شور نہ کرو اور جیسے آپس میں ایک دوسرے سے بےتکلف چہک کر یا تڑخ کر بات کرتے ہو حضورﷺ کے ساتھ یہ طریقہ اختیار کرنا خلافِ ادب ہے۔ آپؐ سے خطاب کرو تو نرم آواز سے تعظیم و احترام کے لہجہ میں ادب و شائستگی کے ساتھ...... آپؐ سے گفتگو کرتے وقت پوری احتیاط رکھنی چاہیئے مبادا بےادبی ہو جائے اور آپؐ کو تکدر پیش آئے تو حضورﷺ کی ناخوشی کے بعد مسلمان کا ٹھکانہ کہاں ہے! ایسی صورت میں تمام اعمال ضائع ہونے اور ساری محنت اکارت جانے کا اندیشہ ہے۔ حضورﷺ کی وفات کے بعد حضورؐ کی احادیث سننے اور پڑھنے کے وقت بھی یہی ادب چاہیے اور قبر شریف کے پاس حاضر ہو وہاں بھی ان آداب کو ملحوظ رکھے''۔(تفسیر عثمانی)

پیر کرم شاہ اس آیت کی توضیح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اگر تمہیں وہاں شرف باریابی نصیب ہو اور ہم کلامی کی سعادت سے بہرہ ور ہو تو یہ خیال رہے کہ تمہاری آواز میرے محبوب کی آواز سے بلند نہ ہونے پائے۔ جب حاضر ہو تو ادب و احترام کی تصویر بن کر حاضری دو۔ اگر اس سلسلہ میں تم نے ذرا سی غفلت برتی اور بے پروائی سے کام لیا تو سارے اعمالِ حسنہ ہجرت' جہاد' عبادات وغیرہ تمام کے تمام اکارت جائیں گے...... فرمایا جا رہا ہے کہ تمہارے سارے اعمال غارت ہو جائیں گے' سب نیکیاں ملیا میٹ ہو جائیں گی اور تمہیں خبر تک نہ ہو گی۔ تم اس غلط فہمی کا شکار ہو گے کہ تم بڑے نمازی اور غازی ہو' صائم الدہر ہو' قائم اللیل ہو' مفسر ہو' محدث ہو' واعظ آتش بیان ہو اور جنت تمہارا انتظار کر رہی ہے اور جب وہاں پہنچو گے تو اُس وقت پتا چلے گا کہ اعمال کا جو باغ تم نے لگایا تھا اسے تو بےادبی اور گستاخی کی بادِ صرصر نے خاکِ سیاہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ اُس وقت کفِ افسوس ملو گے' سر پیٹو گے لیکن بے سود' لاحاصل...... اسی آیت سے استدلال کرتے ہوئے علماء نے فرمایا ہے کہ انسان جب روضۂ مقدس پر حاضری دینے کی سعادت سے بہرہ ور ہو تو وہاں بھی آواز اونچی نہ کرے' جہاں حدیث پاک کا درس ہو رہا ہو وہاں بھی آواز بلند نہ کرے''۔(ضیاء القرآن)

مولانا امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں:

''جن لوگوں کے اندر یہ خناس سمایا ہوا ہو کہ وہ اللہ و رسول کو مشورہ دینے کی پوزیشن میں ہیں' یا جن کو یہ زعم ہو کہ ان کا اسلام قبول کر لینا اسلام اور پیغمبر پر ایک احسان ہے ان کا طرزِ خطاب اور اندازِ کلام رسول کے آگے متواضعانہ اور نیازمندانہ نہیں ہوسکتا تھا...... اور اگر آپ کو مخاطب کرتے تو ادب سے یارسول اللہ کہنے کے بجائے 'یا محمدؐ' کہہ کر مخاطب کرتے...... یہاں ان کو اس غیر مہذب طریقۂ کلام و خطاب سے روکا گیا ہے' کیونکہ یہ چیز غمازی کر رہی تھی کہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ رسول کا اصل مقام و مرتبہ نہیں پہچانا ہے' بلکہ ان کے اندر اپنی برتری کا وہ زعم چھپا ہوا ہے کہ جو بالآخر اُن کے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دینے والا ہے...... اس بے ادبی سے تمہیں اس لیے روکا جا رہا ہے کہ مبادا تمہاری یہ حرکت اس بات کا سبب بن جائے کہ عنداللہ تمہارے سارے اعمال ڈھے جائیں۔'' (تدبر قرآن)

''معارف القرآن'' میں مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے حکیم الاُمت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تفسیر ''بیان القرآن'' کو سہل انداز میں خلاصۂ تفسیر کے عنوان سے ایک تصرف کے ساتھ نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''آواز کا بلند کرنا جو صورۃً بے باکی اور بے پروائی ہے اور بلند آواز سے اس طرح باتیں کرنا جیسے آپس میں ایک دوسرے سے بے تکلف باتیں کرتے ہیں' یہ ایک قسم کی گستاخی ہے۔ اپنے تابع اور خادم کی اس طرح کی گفتگو ناگوار اور ایذادہ ہوسکتی ہے اور اللہ کے رسول کو ایذا پہنچانا تمام اعمالِ خیر کو برباد کر دینے والا ہے۔

اس آیت کے نزول سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ حال ہوگیا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! قسم ہے کہ اب مرتے دم تک آپؐ سے اس طرح بولوں گا جیسے کوئی کسی سے سرگوشی کرتا ہو (درمنثور عن البیہقی)' اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس طرح بولنے لگے کہ بعض اوقات پوچھنا پڑتا تھا۔ (کذا فی الصحاح) حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ طبعی طور پر بلند آواز تھے۔ یہ آیت سن کر وہ بہت ڈرے اور روئے اور اپنی آواز کو گھٹایا (بیان القرآن از درمنثور)۔ قاضی ابوبکر ابن عربی نے فرمایا کہ: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم اور ادب آپؐ کی وفات کے بعد بھی ایسا ہی واجب ہے جیسا حیات میں تھا''۔ (معارف القرآن' الحجرات)

حافظ عمادالدین ابن کثیر مذکورہ آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں:

''الغرض اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے سامنے آوازیں بلند کرنے سے منع فرما دیا۔

امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے دو شخصوں کی کچھ بلند آوازیں مسجد نبوی میں سن کر وہاں آ کر ان سے فرمایا: تمہیں معلوم ہے کہ تم کہاں ہو؟ پھر ان سے پوچھا کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ انہوں نے کہا طائف کے۔ آپؓ نے فرمایا کہ اگر تم مدینے کے ہوتے تو میں تمہیں پوری سزا دیتا۔ علماء کرام کا فرمان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر شریف کے پاس بھی بلند آواز سے بولنا مکروہ ہے' جیسے کہ آپؐ کی حیات میں آپؐ کے سامنے مکروہ تھا' اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح اپنی زندگی میں قابل احترام وعزت تھے اب اور ہمیشہ اپنی قبر شریف میں بھی باعزت اور قابل احترام ہیں ...... جیسے اور جگہ ہے ''اے مسلمانو! رسول کو اس طرح نہ پکارو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو'' (النور) پھر فرماتا ہے کہ ہم نے تمہیں بلند آوازی سے اس لیے روکا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ کسی وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہو جائیں اور آپؐ کی ناراضگی کی وجہ سے خدا ناراض ہو جائے اور تمہارے کل اعمال ضبط کر لے اور تمہیں اس کا پتا بھی نہ چلے۔'' (ابن کثیر' جلد پنجم)

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن عافیت سے وابستہ رہ کر جن اصحاب نے اسلامی آداب و تہذیب کی تربیت پائی وہ ہر لحظہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوقات کا بھی پاس کرتے تھے اور نہایت متانت' سنجیدگی اور شائستگی کے ساتھ ان سے پیش آتے تھے' مگر باقی لوگ تہذیب و معاشرت کے قرینوں سے آشنا نہ تھے۔ صحرانشین بدوؤں کی حالت زیادہ ناگفتہ بہ تھی اس لیے وہ ناشائستگی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ قرآن نے ان کے اس طرزِ عمل کو ان کی ناسمجھی سے تعبیر کیا ہے۔ اللہ نے اس ناشائستہ طرزِ عمل پر انہیں ملامت کرتے ہوئے انہیں آداب کے حدود کا خیال رکھنے کی تاکید کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جن کے دلوں میں واقعتاً تقویٰ موجود ہے وہ حضور کے ادب واحترام میں کوتاہی نہیں کرتے۔ معلوم ہوا کہ جو دل رسول کے احترام سے خالی ہیں وہ حقیقت میں تقویٰ کی کیفیت سے محروم ہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کا تقاضا ان کی توقیر و تعظیم ہے اور اسی کی کوکھ سے اطاعت کا جذبہ جنم لیتا ہے اور اسی سوتے سے محبت کے جذبات پھوٹتے ہیں اور پھر بندۂ مؤمن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر ہر نقش قدم کی پیروی کو اپنے اوپر لازم کر لیتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کی محبت بھی پختہ تر ہوتی چلی جاتی ہے اور پھر وہ زندگی کے کسی بھی مرحلہ میں اللہ و رسول کے احکام سے سرتابی نہیں کرتا' بلکہ ہر لمحہ اس کی بڑائی بیان کرنے کے لیے مستعد رہتا ہے اور غلبۂ دین کی کوشش اس کا مقصد وحید بن جاتی ہے۔ OO

1

جدید دنیائے اسلام

قسط وار سلسلہ (31)

تاجکستان

(TAJIKISTAN)

تحقیق و تحریر: سید قاسم محمود

تاجکستان : ایک نظر میں

پورا نام: جمہوریہ تاجکستان
رقبہ: 143,100 کلومیٹر
آبادی: 72 لاکھ
اوسط عمر: 64 سال
سالانہ شرح پیدائش: 2.14 فیصد
آبادی کی گنجانی: 127 فی مربع کلومیٹر
دارالحکومت: دوشنبے
زبانیں: تاجیکی، روسی
نسلیں: تاجیک 65.1 فیصد، ازبک 25 فیصد، روسی 3.5 فیصد
مذہب: مسلمان 90 فیصد، دیگر 10 فیصد
شرح خواندگی: 99 فیصد
کل قومی پیداوار: سات ارب ڈالر سالانہ
فی کس آمدنی: ایک ہزار ڈالر سالانہ
غریب آبادی: 60 فیصد
بے روزگاری: 40 فیصد
کرنسی: سومونی

ٹیلی ویژن: ڈھائی لاکھ
موبائل: پچاس ہزار
ٹی وی سٹیشن: 13
ریلوے: 482 کلومیٹر
بندرگاہ: صفر
ہوائی اڈے: 66
کل فوج: دس ہزار
کاروں کی تعداد فی ہزار: 3
زراعت: کپاس، اجناس، پھل، انگور، سبزیاں، مویشی
صنعت: المونیم، زنک، سیسہ، کیمیکل، کھاد، سیمنٹ، مشینی اوزار، گھریلو اشیاء
برآمدات: 750 ملین ڈالر
درآمدات: 890 ملین ڈالر
تجارتی ساتھی: ہالینڈ، روس، ترکی، ازبکستان، لٹیویا، قازقستان، سوئٹزرلینڈ، آذربائیجان، یوکرین، رومانیہ، ایران

تاجکستان

پہلے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تاجک یا تاجیک کون ہیں؟

''اردو دائرہ معارف اسلامیہ'' کے مقالہ نگار بارٹولڈ اِس کی تعریف یوں کرتے ہیں: ''ایک قوم کا نام۔ ابتدا میں عرب مراد تھے۔ بعد میں اس کا مفہوم ''ترک'' کے مقابلے میں ''ایرانی'' ہوگیا۔ یہ لفظ عرب قبیلے طئی کے نام سے ماخوذ ہے۔ ایرانیوں سے نزدیک ترین عرب قبیلہ بنوطئی کا تھا، اس لیے اس قبیلے کا نام تمام عربوں کے لیے استعمال ہونے لگا۔ عرب کے معنی میں اس کا مترادف لفظ پہلوی زبان میں تاچیک ہے۔''

وسط ایشیا کے ایرانی لوگ مسلمان فاتحین کو ''تازیک'' کہہ کر پکارا کرتے تھے' اس لیے کہ اس وقت عام خیال یہ تھا کہ اگر کوئی ایرانی اسلام قبول کر لیتا تو وہ بھی عرب بن جاتا۔ چنانچہ جب یہ لفظ ترکوں کو پہنچا تو اس کے معنی تھے ''مسلمان'' یا ''دارالاسلام سے آنے والا''۔ چونکہ غیر ترک مسلمانوں میں' جن سے ترک واقف تھے' ایرانیوں کی کثرت تھی' اس لیے ترکی زبان میں تاجیک کے معنی ایرانی کے ہو گئے۔ اُس زمانے میں خود ایرانی بھی اپنے آپ کو ترکی امراء کے مقابلے میں ''تازیک'' کہنے لگے تھے۔

موجودہ زمانے میں ''تاجیک'' کا لفظ کبھی کبھی خالص فارسیوں کے مقابلے میں مشرقی ایرانیوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ وہ علاقہ جو استرآباد اور یزد کے درمیان ہے' تاجیکوں کے علاقے کی مغربی حد سمجھا جاتا ہے۔ ترکستان میں' خصوصاً ازبکوں کے عہد میں' تاجیک لوگوں کو بتدریج میدانوں سے بے دخل کر کے پہاڑوں کی طرف نکال دیا گیا۔ اہل رُوس ترکستان کے تمام ایرانیوں کو تاجیکوں کے ذیل میں شامل کرتے ہیں۔

موجودہ تاجکستان وسط ایشیا کے مسلم ممالک میں سب سے چھوٹا ملک ہے۔ زمانۂ قدیم میں یہ علاقہ سلطنت فارس کا حصہ تھا جو پہلے دارا اوّل اور بعد ازاں سکندرِ اعظم کے ماتحت رہا۔ ساتویں اور آٹھویں صدی میں اسلام کے زیرِ نگیں آیا۔ 1860ء تک ازبکوں اور افغانیوں کے زیرِ تسلط رہا۔ اس سال روس نے اپنا تسلط قائم کیا۔ 1924ء میں تاجکستان میں خودمختار جمہوریت قائم ہوئی تو اس میں تاجیکوں کی تعداد 8 لاکھ سے زیادہ تھی۔ 1929ء میں سوویت یونین کے تحت ایک الگ سوویت کی حیثیت دے دی گئی۔

1961ء۔ تاجکستان کے دارالحکومت کا نام اسٹالن آباد تھا' لیکن جب اسٹالن کی آمریت کے خلاف احتجاجی تحریک شروع ہوئی تو اس کا نام بدل کر دوشنبے رکھ دیا گیا جو اس کا پرانا نام تھا۔

1991ء ۔نومبر میں سوویت یونین کی تحلیل کے بعد تاجکستان نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ آزادی کے بعد کمیونسٹ حکومت کے خلاف اسلام پسند جمہوری جماعتوں نے احتجاجی تحریک شروع کی' جس نے خانہ جنگی کی سی صورت اختیار کر لی۔ یہ خانہ جنگی 27 جون 1997ء کو ختم ہوئی جب حکومت اور حزبِ اختلاف کے مابین معاہدۂ امن ہوا۔ خانہ جنگی کے دوران میں تقریباً ساٹھ ہزار لوگ مارے گئے۔ تاہم بعد میں بھی' بلکہ اب تک اسلام پسند حزب اختلاف اور اشتراکیت نواز حکومت کے مابین پرتشدد فسادات ہوتے رہتے ہیں۔

2003ء۔ جون میں حکومت نے ایک ریفرنڈم کرایا جس کے ذریعے صدر امومالی زخمونوف اگلے چودہ برس کے لیے ملک کے صدر بن گئے۔ تاہم حزب اختلاف نے الزام لگایا کہ وسیع پیمانے پر دھاندلی ہوئی ہے۔

جغرافیائی خدوخال

تاجکستان شمال میں ازبکستان اور کرغزستان سے گھرا ہوا ہے۔اس کی مغربی سرحد پر ازبکستان واقع ہے، جبکہ جنوب میں اس کی سرحد افغانستان سے ملتی ہے۔مشرق میں چین کا صوبہ سنکیانگ پھیلا ہوا ہے۔پاکستان کی سرحدیں بھی تاجکستان کے بہت قریب ہیں۔اس میں دوشنبے، قلیاب، گورنو، بدخشاں اور لینن آباد کے صوبے شامل ہیں۔

تاجکستان ایک پہاڑی ملک ہے۔ملک کے جنوب مغربی حصے میں پامیر کی پہاڑی پھیلی ہوئی ہے۔پامیر کی پہاڑی گانٹھ کو تاجکستان میں پامیر اعلیٰ کے نام سے جانا جاتا ہے۔اس کی ایک چوٹی بنام لینن کی بلندی 7495 میٹر اور اشترا کی چوٹی کی بلندی بھی 7495 میٹر ہے۔تاجکستان کا فید چنکو (Fed Chenko) گلیشیر دنیا کے عظیم ترین گلیشیئروں میں سے ایک ہے۔دریائے آمُو اسی گلیشیئر سے نکل کر تاجکستان اور افغانستان کی سرحد پر بہتا ہوا، ازبکستان سے گزر کر اپنا پانی ارال جھیل میں گراتا ہے۔

تاجکستان کا دارالحکومت دوشنبے ہے جس کی موجودہ آبادی سوا آٹھ لاکھ ہے۔1927ء سے 1961ء تک اس کا نام اسٹالن آباد تھا، لیکن جب 1961ء میں اسٹالن کے خلاف عوامی احتجاجی تحریک چلی تو اس کا نام بدل کر دوشنبے رکھ دیا گیا جو اس کا پرانا نام تھا۔دوشنبے تاجکی تہذیب کا ایک اہم تاریخی اور تجارتی شہر ہے۔دوسرا بڑا شہر خوزنٹ ہے جس کی آبادی پونے دو لاکھ کے قریب ہے۔پہلے اس کا نام لینن گراڈ تھا، لیکن سوویت یونین کی تحلیل کے بعد پرانا نام بحال کر دیا گیا۔دوسرے بڑے شہروں میں بیکاباد (آبادی سوا لاکھ) اور ترمیز (آبادی سوا لاکھ) قابل ذکر ہیں۔

معاشی صورتِ حال

تاجکستان سابقہ سوویت ریاستوں میں سب سے غریب ملک ہے۔کپاس یہاں کی سب سے اہم فصل ہے۔معدنیات ہیں مگر کم۔صنعت صرف المونیم کے ایک پلانٹ اور دیگر چھوٹے چھوٹے کارخانوں پر مشتمل ہے۔1992ء تا 1997ء کی خانہ جنگی نے پہلے سے کمزور معاشی نظام کو مزید نقصان پہنچایا اور زرعی و صنعتی ترقی بالکل رک گئی۔تاہم 1997ء سے معاشی ترقی کا پہیہ گردش میں ہے، اگرچہ اب بھی ملک کی 60 فیصد آبادی غربت کے عالم میں ہے۔نج کاری کے اچھے اثرات ظاہر ہوئے ہیں۔لیکن حکومت کو بے روزگاری، افراطِ زر، کمزور نظم ونسق، اصلاحات کی سست رفتاری اور غیر ملکی قرضوں کے بوجھ جیسے معاشی مسائل کا سامنا ہے۔